رہنمائے نثر

ڈاکٹر خلیل احمد مُشیر (ایم اے)

اُردُو۔ انگلش، معاشیات

رہنمائے نثر



ڈاکٹر خلیل احمد مُشیر (ایم۔اے)
اُردو۔ انگلش، معاشیات

Rs- 2/50

قیمت :- دو روپے پچاس پیسے

مطبوعہ

سُو لیتھو پریس، پٹودی ہاؤس دہلی

فہرست

قصہ آزاد بخت

اے شاہو! پادشاہ کا اب ماجرا سُنو
جو کُچھ کہ میں نے دیکھا ہے اور ہے سُنا، سُنو
کہتا ہوں میں فقیروں کی خدمت میں سر بسر
احوال میرا، خوب طرح دل لگا سُنو

میرے قبلہ گاہ نے جب وفات پائی اور میں اس تخت پر بیٹھا عین عالم شباب کا تھا، اور سارا یہ ملک روم کا میرے حکم میں تھا۔ اتفاقاً ایک سال کوئی سوداگر بدخشاں کے مُلک سے آیا اور اسباب تجارت کا بہت سا لایا، خبرداروں نے میرے حضور میں خبر کی کہ ایسا بڑا تاجر آج تک شہر میں نہیں آیا، میں نے اُس کو طلب فرمایا۔

وہ تحفے ہر ایک ملک کے لائق میری نذر کے لے کر آیا۔ فی الواقع ہر ایک جنس بے بہا نظر آئی، چنانچہ ایک ڈبیا میں ایک لعل تھا، نہایت خوش رنگ اور آب دار قدو قامت اور وزن میں پانچ مثقال کا۔ میں نے باوجود سلطنت کے ایسا جواہر کبھو نہ دیکھا تھا، اور نہ کسو سے سنا تھا، پسند کیا۔ سوداگر کو بہت سا انعام و اکرام دیا اور سند راہ داری کی لکھ دی کہ اس سے ہماری تمام قلم رو میں کوئی مزاحم محصول کا نہ ہو،

جہاں جاوے اس کو آرام سے رکھیں۔ چوکی پہرے میں حاضر رہیں، اس کا نقصان اپنا نقصان سمجھیں۔ وہ تاجر حضور میں دربار کے وقت حاضر رہتا اور آدابِ سلطنت سے خوب واقف تھا۔ اور تقریر و خوش گوئی اس کی لائق سننے کے تھی اور میں اس لعل کو ہر روز جواہر خانے سے منگوا کر سرِ دربار دیکھا کرتا۔

ایک روز دیوانِ عام کئے بیٹھا تھا، اور امرا ارکانِ دولت اپنے پائے پر کھڑے تھے، اور ہر ملک کے پادشاہوں کے ایلچی مبارک باد کی خاطر جو آئے تھے وہ بھی سب حاضر تھے۔ اس وقت میں نے موافق معمول کے اس لعل کو منگوایا جواہر خانے کا داروغہ لے کر آیا، میں ہاتھ میں لے کر تعریف کرنے لگا اور فرنگ کے ایلچی کو دیا۔ اُن نے دیکھ کر تبسّم کیا اور زمانہ سازی سے صفت کی۔ اسی طرح ہاتھوں ہاتھ ہر ایک نے لیا اور دیکھا اور ایک زبان ہو کر بولے کہ قبلۂ عالم کے اقبال کے باعث یہ میسّر ہوا ہے، واللہ کسو پادشاہ کے ہاتھ آج تک ایسا رقم بے بہا نہیں لگا۔ اس وقت میرے قبلہ گاہ کا وزیر کہ مرد دانا تھا، اور اسی خدمت پر سرفراز تھا وزارت کی چوکی پر کھڑا تھا، آداب بجا لایا اور التماس کیا کہ کچھ عرض کیا چاہتا ہوں اگر جان بخشی ہو۔

میں نے حکم کیا کہ کہہ وہ بولا قبلۂ عالم! آپ بادشاہ ہیں، اور بادشاہوں سے بہت بعید ہے کہ ایک پتھر کی اتنی تعریف کریں، اگرچہ رنگ ڈھنگ سنگ میں لاثانی ہے لیکن سنگ ہے، اور اس دم سب ملکوں کے ایلچی

دربار میں حاضر ہیں۔ جب اپنے اپنے شہر میں جاویں گے البتہ یہ نقل کریں گے کہ عجب بادشاہ ہے کہ ایک لعل کہیں سے پایا ہے اسے ایسا تحفہ بنایا ہے کہ ہر روز روبرو منگاتا ہے۔ اور آپ اس کی تعریف کر کر سب کو دکھاتا ہے۔ پس جو پادشاہ یا راجہ یہ احوال سنے گا، اپنی مجلس میں ہنسے گا۔ خداوند! ایک ادنیٰ سوداگر نیشاپور میں ہے، اس نے بارہ دانے لعل کے کہ ہر ایک سات سات مثقال کا ہے پٹے میں نصب کر کر کتے کے گلے میں ڈال دیئے ہیں۔ مجھے یہ سنتے ہی غصہ چڑھ آیا، اور کھسیانے ہو کر فرمایا کہ اس وزیر کی گردن مارو۔

جلادوں نے وونہیں اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور چاہا کہ باہر لے جاویں۔ فرنگ کے بادشاہ کا ایلچی دست بستہ روبرو آکھڑا ہوا۔ میں نے پوچھا کہ تیرا کیا مطلب ہے؟ اس نے عرض کی امیدوار ہوں کہ تقصیر سے وزیر کی واقف ہوں۔ میں نے فرمایا کہ جھوٹ بولنے سے اور بڑا گناہ کون سا ہے خصوصاً بادشاہوں کے روبرو؟ اُن نے کہا، اس کا دروغ ثابت نہیں ہوا، شاید جو کچھ کہ عرض کی ہے سچ ہو۔ ابھی بے گناہ کا قتل کرنا درست نہیں۔ اس کا میں نے یہ جواب دیا کہ ہرگز عقل میں نہیں آتا ایک تاجر کہ نفع کے واسطے شہر بہ شہر اور ملک بملک خراب ہوتا پھرتا ہے اور کوڑی کوڑی جمع کرتا ہے، بارہ دانے لعل کے جو وزن میں سات سات مثقال کے ہوں، کتے کے پٹے میں لگا دے۔ اس نے کہا خدا کی قدرت سے تعجب نہیں۔ شاید کہ باشد، ایسے تحفے اکثر سوداگر و

اور فقیروں کے ہاتھ آتے ہیں۔ اس واسطے کہ یہ دونوں ہر ایک ملک میں جاتے ہیں اور جہاں سے جو کچھ پاتے ہیں لے آتے ہیں صلاح دولت یہ ہے کہ اگر وزیر ایسا ہی تقصیر وار ہے، تو حکم قید کا ہو، اس لئے کہ وزیر بادشاہوں کی عقل ہوتے ہیں، اور یہ حرکت سلاطینوں سے بدنما ہے کہ ایسی بات پر کہ جھوٹ سچ اس کا ابھی ثابت نہیں ہوا حکم قتل کا فرمائیں، اور اس کی تمام عمر کی خدمت اور نمک حلالی بھول جائیں۔

بادشاہ سلامت! اگلے شہریاروں نے بندی خانہ اسی سبب سے ایجاد کیا ہے کہ پادشاہ یا سردار اگر کسو پر غضب ہوں تو اسے قید کریں۔ کئی دن میں غصہ جاتا رہے گا اور بے تقصیری اس کی ظاہر ہوگی، پادشاہ خون ناحق سے محفوظ رہیں گے، کل روز قیامت میں ماخوذ نہ ہوئیں گے۔ میں نے جتنا اس کے قائل کرنے کو چاہا، اس نے ایسی معقول گفتگو کی کہ مجھے لاجواب کیا۔ تب میں نے کہا کہ خیر تیرا کہنا پذیرا ہوا، میں خون سے اس کے درگذرا لیکن زنداں میں مقید رہے گا۔ اگر ایک سال کے عرصے میں اس کا سخن راست ہوا کہ جیسے لعل کتے کے گلے میں ہیں تو اس کی نجات ہو گی اور نہیں تو بڑے عذاب سے مارا جاوے گا۔ فرمایا کہ وزیر کو بندی خانہ میں لے جاؤ۔ یہ حکم سن کر ایلچی نے زمین خدمت کی چومی اور تسلیمات کی۔

جب یہ خبر وزیر کے گھر میں گئی آہ واویلا مچا، اور ماتم سرا ہو گیا اس وزیر کی ایک بیٹی تھی برس چودہ پندرہ کی نہایت خوب صورت اور

قابل، نوشت و خواند میں درست۔ وزیر اس کو نپٹ پیار کرتا تھا اور عزیز رکھتا تھا چنانچہ اپنے دیوان خانے کے پچھواڑے ایک رنگ محل اس کی خاطر بنوا دیا تھا اور لڑکیاں عمدوں کی اس کی مصاحبت میں اور خواصیں تکمیل خدمت میں رہتیں۔ ان سے ہنسی خوشی کھیلا کودا کرتی۔

اتفاقاً جس دن وزیر کو محبس خانے میں بھیجا وہ لڑکی اپنی ہمجولیوں میں بیٹھی تھی اور خوشی سے گڑیا کا بیاہ رچایا تھا، اور ڈھولک پکھاوج لیے ہوئے رتجگے کی تیاری کر رہی تھی، اور کڑاہی چڑھا کر گلگلے اور رتم تلنی بنا رہی تھی کہ ایک بارگی اس کی ماں روتی پیٹتی سر کھلے پاؤں ننگے بیٹی کے گھر میں گئی، اور دو ہتڑ اس لڑکی کے سر پر ماری اور کہنے لگی۔ کاش کے تیرے بدلے خدا اندھا بیٹا دیتا، تو میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوتا، اور باپ کا رفیق ہوتا۔ وزیر زادی نے پوچھا اندھا بیٹا تمھارے کس کام آتا؟ جو کچھ بیٹا کرتا میں بھی کر سکتی ہوں۔ اماں نے جواب دیا خاک تیرے سر پر؛ باپ پر یہ بپتا بپتی ہے کہ بادشاہ کے روبرو کچھ ایسی بات کہی کہ بندی خانے میں قید ہوا۔ اس نے پوچھا وہ کیا بات تھی؟ ذرا میں بھی سنوں۔ تب وزیر کے قبیلے نے کہا کہ تیرے باپ نے شاید یہ کہا کہ نیشاپور میں کوئی سوداگر ہے اس نے بارہ عدد لعل بے بہا کتے کے پٹے میں ٹانکے ہیں۔ بادشاہ کو باور نہ ہوا اسے جھوٹا سمجھا اور اسیر کیا، اگر آج کے دن بیٹا ہوتا تو ہر طرح سے کوشش کر کر اس بات کو تحقیق کرتا اور اپنے باپ کا ایراد کرتا اور بادشاہ سے عرض معروض کر کے میرے خاوند کو بندی خانے سے مخلصی

دلواتا۔

وزیرزادی بولی، اماں جان! تقدیر سے لڑا نہیں جاتا، چاہیے انسان بلائے ناگہانی میں صبر کرے اور امیدوار فضل الٰہی کا رہے۔ وہ کریم ہے مشکل کسو کی اٹکی نہیں رکھتا اور رونا دھونا خوب نہیں۔ مبادا دشمن اور طرح سے بادشاہ کے پاس لگا دیں اور لُترے چغلی کھا دیں کہ باعث زیادہ خفگی کا ہو، بلکہ جہاں پناہ کے حق میں دُعا کرو، ہم اس کے خانہ زاد ہیں وہ ہمارا خداوند ہے، وہی غضب ہوا ہے وہی مہربان ہوگا۔ اس لڑکی نے عقل مندی سے ایسی ایسی طرح ماں کو سمجھایا کہ کچھ اس کو صبر و قرار آیا، تب اپنے محل میں گئی اور چپکی ہو رہی جب رات ہوئی، وزیرزادی نے دادا کو بلایا۔ اس کے ہاتھ پاؤں پڑی بہت سی منت کی اور رونے لگی اور کہا میں یہ ارادہ رکھتی ہوں کہ اماں کا طعنہ مجھ پر نہ رہے اور میرا باپ مخلصی پاوے، تو میرا رفیق ہو تو میں نیشاپور کو چلوں، اور اس تاجر کو (جس کے کتے کے گلے میں ایسے لعل ہیں) دیکھ کر جو بن آوے کر آؤں، اور اپنے باپ کو چھڑاؤں۔

پہلے اس مرد نے انکار کیا، آخر بہت کہنے سننے سے راضی ہوا، تب وزیرزادی نے فرمایا چپکے چپکے اسباب سفر کا درست کر اور جنس تجارت کی لائق نذر پادشاہوں کے خرید کر اور غلام و نوکر چاکر جتنے ضرور ہوں ساتھ لے، لیکن یہ بات کسو پر نہ کھلے۔ دادا نے قبول کیا۔ اور اس کی تیاری میں لگا جب سب اسباب مہیا کیا، اونٹوں اور خچروں پر بار کر کر روانہ ہوا، اور وزیرزادی بھی لباس مردانہ پہن کر ساتھ جا ملی، ہرگز کسو کو خبر نہ ہوئی۔ جب صبح ہوئی وزیر

کے محل میں چرچا ہوا کہ وزیرزادی غائب ہے، معلوم نہیں کیا ہوئی۔

آخر بدنامی کے ڈر سے ماں نے بیٹی کا گم ہونا چھپایا، اور وہاں وزیرزادی نے اپنا نام سوداگر بچہ رکھا۔ منزل بمنزل چلتے چلتے نیشاپور میں پہنچی۔ خوشی بہ خوشی کارواں سرا میں جا اتری، اور سب اپنا اسباب اتار رات کو رہی۔ فجر کو حمام میں گئی اور پوشاک پاکیزہ جیسے روم کے باشندے پہنتے ہیں پہنی اور شہر کی سیر کے واسطے نکلی۔ آتے آتے جب چوک میں پہنچی چورستے پر کھڑی ہوئی تو ایک طرف دوکان جوہری کی نظر پڑی کہ بہت سے جواہر کا ڈھیر لگ رہا ہے اور غلام لباس فاخرہ پہنے ہوئے دست بستہ کھڑے ہیں اور ایک شخص جو سردار ہے، برس پچاس ایک کے اس کی عمر ہے، طالع مندوں کی سی خلعت اور نیم آستین پہنے ہوئے، اور کئی مصاحب باوضع نزدیک اس کے کرسیوں پر بیٹھے ہیں اور آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔

وہ وزیرزادی (جس نے اپنے تئیں سوداگر بچہ مشہور کیا تھا) اسے دیکھ کر متعجب ہوئی، اور دل میں سمجھ کر خوش ہوئی کہ جھوٹ نہ کرے جس سوداگر کا میرے باپ نے پادشاہ سے مذکور کیا ہے، اغلب ہے کہ یہی ہو بارے خدایا! اس کا احوال مجھ پر ظاہر کر۔ اتفاقاً ایک طرف جو دیکھا تو ایک دوکان ہے اس میں دو پنجرے آہنی لٹکتے ہیں، اور ان دونوں میں دو آدمی قید ہیں۔ ان کی مجنوں کی سی صورت ہو رہی ہے، کہ چرم و استخواں باقی ہے اور سر کے بال اور ناخن بڑھ گئے ہیں، سر اونددھائے بیٹھے ہیں اور دو حبشی بدہیئت مسلح دونوں طرف کھڑے ہیں۔ سوداگر بچے کو اچنبھا آیا، لاحول پڑھ کر دوسری طرف جو

دیکھا تو ایک دوکان میں قالیچے بچھے ہیں، ان پر ایک چوکی ہاتھی دانت کی اس پر گدیلا مخمل کا پڑا ہوا، ایک کتا جواہر کا پٹا گلے میں اور سونے کی زنجیر سے بندھا ہوا بیٹھا ہے، اور دو غلام امرد خوبصورت اس کی خدمت کر رہے ہیں، ایک تو مورچھل جڑاؤ دستے کا لئے جھلتا ہے، اور دوسرا رومال تارکشی کا ہاتھ میں لے کر منھ اور پاؤں اس کا پونچھ رہا ہے۔ سوداگر بچے نے خوب غور کر کر جو دیکھا تو پٹے میں کتے کے بارھوں دانے لعل کے جیسے سنے تھے موجود ہیں شکر خدا کا کیا اور فکر میں گیا کہ کس صورت سے ان لعلوں کو پادشاہ پاس لے جاؤں اور دکھا کر اپنے باپ کو چھڑاؤں؟ یہ تو اس حیرانی میں تھا اور تمام خلقت چوک اور رستے کی اس کا حسن وجمال دیکھ کر حیران تھی، اور ہکا بکا ہو رہی تھی۔ سب آدمی آپس میں یہ چرچا کرتے تھے کہ آج تک اس صورت وشبیہ کا انسان نظر نہیں آیا اس خواجہ نے بھی دیکھا، ایک غلام کو بھیجا کہ تو جا کر بمنت اس سوداگر بچے کو میرے پاس بلا لا۔

وہ غلام آیا اور خواجہ کا پیام لایا کہ اگر مہربانی فرمائیے تو ہمارا خداوند صاحب کا مشتاق ہے، چل کر ملاقات کیجئے۔ سوداگر بچہ تو چاہتا ہی تھا بولا کیا مضائقہ؟ جونہی خواجہ کے نزدیک آیا اور اس پر خواجہ کی نظر پڑی ایک برچھی عشق کی سینے میں گڑی، تعظیم کی خاطر سروقد اٹھا لیکن حواس باختہ۔ سوداگر بچے نے دریافت کیا کہ اب یہ دام میں آیا، آپس میں بغل گیری ہوئے۔ خواجہ نے سوداگر بچے کی پیشانی کو بوسہ دیا اور اپنے برابر بٹھایا، بہت سا تملق

کر کے پوچھا کہ اپنے نام و نسب سے مجھے آگاہ کرو، کہاں سے آنا ہوا اور کہاں کا ارادہ ہے؟ سوداگر بچہ بولا کہ اس کم ترین کا وطن روم ہے اور قدیم سے استنبول زاد بوم ہے، میرے قبلہ گاہ سوداگر ہیں۔ اب بسبب پیری کے طاقت سیر و سفر کی نہیں رہی اس واسطے مجھے رخصت کیا ہے کہ کاروبار تجارت کا سیکھوں۔ آج تلک میں نے قدم گھر سے باہر نہ نکالا تھا، یہ پہلا ہی سفر درپیش ہوا، دریا کی راہ ہوا و نہ پڑا، خشکی کی طرف سے قصد کیا، لیکن اس عجم کے ملک میں آپ کے اخلاق اور خوبیوں کا جو شور ہے، محض صاحب کی ملاقات کی آرزو میں یہاں تک آیا ہوں۔ بارے فضل الٰہی سے خدمت شریف میں مشرف ہوا اور اس سے زیادہ پایا، تمنا دل کی بر آئی۔ خدا سلامت رکھے، اب یہاں سے کوچ کروں گا۔

یہ سنتے ہی خواجہ کے عقل و ہوش جاتے رہے، بولا کہ اے فرزند! ایسی بات مجھے نہ سناؤ، کوئی دن غریب خانے میں کرم فرماؤ۔ بھلا یہ تو بتاؤ کہ تمہارا اسباب اور نوکر چاکر کہاں ہیں؟ سوداگر بچے نے کہا کہ مسافر کا گھر سرا ہے، انھیں وہاں چھوڑ اکر میں آپ کے پاس آیا ہوں خواجہ نے کہا کہ بھٹیار خانے میں رہنا مناسب نہیں، میرا شہر میں اعتبار ہے اور بڑا نام ہے، جلد انھیں بلوا لو۔ میں ایک مکان تمہارے اسباب کے لئے خالی کر دیتا ہوں، جو کچھ جنس لائے ہو، میں دیکھوں ایسی تدبیر کراؤں گا کہ یہیں تمہیں بہت سا نفع ملے۔ تم بھی خوش ہو گے اور سفر کے ہرج مرج سے بچو گے، اور مجھے بھی چند روز رہنے سے اپنا احسان مند کرو گے۔

سوداگر بچے نے اوپری دل سے عذر کیا لیکن خواجہ نے پذیرانہ کیا، اور
اپنے گماشتے کو فرمایا کہ باربردار جلد بھیجو اور کارواں سرا سے ان کا
اسباب منگوا کر فلانے مکان میں رکھواؤ۔ سوداگر بچے نے ایک زنگی
غلام کو ان کے ساتھ کر دیا کہ سب مال متاع لدوا کر لے آ، اور آپ
شام تلک خواجہ کے ساتھ بیٹھا رہا۔ جب گجری کا وقت ہو چکا، اور
دوکان بڑھائی، خواجہ گھر کو چلا، تب دونوں غلاموں میں سے ایک نے
کتے کو بغل میں لیا، دوسرے نے کرسی اور قالیچہ اٹھا لیا، اور ان دونوں
حبشی غلاموں نے اس پنجرے کو مزدوروں کے سر پر دھر دیا، اور آپ
پانچوں ہتھیار باندھے ساتھ ہوئے۔ خواجہ سوداگر بچے کا ہاتھ ہاتھ میں
لئے باتیں کرتا ہوا حویلی میں آیا۔ سوداگر بچے نے دیکھا کہ مکان عالی شان
لائق بادشاہوں یا امیروں کے ہے۔ لب نہر فرش چاندنی کا بچھا ہے،
اور مسند کے روبرو اسباب عیش کا چنا ہے، کتے کی صندلی بھی اسی جگہ
بچھائی، اور خواجہ سوداگر بچے کو لے کر بیٹھا، بے تکلف تواضع شراب کی کی
دونوں پینے لگے۔ جب سر خوش ہوئے تب خواجہ نے کھانا مانگا، دسترخوان
بچھا اور دنیا کی نعمت چنی گئی۔ پہلے ایک لنگری میں کھانا لے کر سرپوش طلائی
ڈھانپ کر کتے کے واسطے لے گئے، اور ایک دسترخوان زربفت کا بچھا کر
اس کے آگے دھر دی۔ کتا صندلی سے نیچے اتر کر جتنا چاہا اتنا کھایا، اور
سونے کی لگن میں پانی پیا، پھر چوکی پر بیٹھا۔ غلاموں نے رومال سے ہاتھ
منھ اس کا پاک کیا، پھر اس طباق اور لگن کو غلام پنجرے کے نزدیک لے گئے

اور خواجہ سے کنجی مانگ کر قفل قفس کا کھولا۔

ان دونوں انسانوں کو باہر نکال کر کئی سونٹے مار کر کتے کا جھوٹا انھیں کھلایا اور وہی پانی پلایا۔ پھر تالا بند کر کر تالی خواجہ کے حوالے کی۔ جب یہ سب ہو چکا، تب خواجہ نے آپ کھانا شروع کیا۔ سوداگر بچے کو یہ حرکت پسند نہ آئی، گھن کھا کر ہاتھ کھانے میں نہ ڈالا۔ ہر چند خواجہ نے منت کی پر اس نے انکار ہی کیا۔ تب خواجہ نے سبب اس کا پوچھا کہ تم کیوں نہیں کھاتے؟ سوداگر بچے نے کہا، یہ حرکت تمہاری اپنے تئیں بدنما معلوم ہوئی! اس لیے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور کتا نجس العین ہے۔ پس خدا کے دو بندوں کو کتے کا جھوٹا کھلانا کس مذہب و ملت میں روا ہے؟ نقط یہ غنیمت نہیں جانتے کہ وے تمہاری قید میں ہیں؟ نہیں تو تم اور وے برابر ہیں۔ اب میرے تئیں شک آئی کہ تم مسلمان نہیں، کیا جانوں کون ہو کہ کتے کو پوجتے ہو؟ مجھے تمہارا کھانا کھانا مکروہ ہے جب تلک یہ شبہ دل سے دور نہ ہو۔

خواجہ نے کہا اے بابا! جو کچھ تو کہتا ہے بہ سب یہ سب سمجھتا ہوں اور اسی خاطر بدنام ہوں کہ اس شہر کی خلقت نے میرا نام خواجہ سگ پرست رکھا ہے، اسی طرح پکارتے ہیں، اور مشہور کیا ہے۔ لیکن خدا کی لعنت کافروں اور مشرکوں پر ہو جیو۔ کلمہ پڑھا اور سوداگر بچے کی خاطر جمع کی۔ تب سوداگر بچے نے پوچھا کہ اگر مسلمان بہ دل ہو، تو اس کا کیا باعث ہے؟ ایسی حرکت کر کے اپنے تئیں بدنام کیا ہے، خواجہ نے کہا اے فرزند! نام میرا بدنام ہے اور دوگنا محصول اس شہر میں بھرتا ہوں، اسی واسطے کہ بھید کسو پر ظاہر نہ ہو۔ عجب یہ ماجرا ہے کہ جو کوئی سنے سوائے

غم اور غصّے کے اسے کچھ اور حاصل نہ ہو۔ تو بھی مجھے معاف رکھ، کہ نہ مجھ میں قدرت کہنے کی اور نہ تجھ میں طاقت سننے کی رہے گی۔ سوداگر بچّے نے اپنے دل میں غور کی کہ مجھے اپنے کام سے کام ہے، کیا ضرور ہے جو ناحق میں زیادہ مجوز ہوں؟ بولا خیر اگر لائق کہنے کے نہیں تو نہ کہیے۔ کھانے میں ہاتھ ڈالا اور نوالہ اٹھا کر کھانے لگا۔ دو مہینے تک اس ہوشیاری اور عقل مندی سے سوداگر بچّے نے خواجہ کے ساتھ گذران کی کہ کسو پر ہرگز نہ کھلا کہ یہ عورت ہے۔ سب یہی جانتے تھے کہ مرد ہے، اور خواجہ سے روز بروز ایسی محبت زیادہ ہوئی کہ ایک دم اپنی آنکھوں سے جدا نہ کرتا۔

ایک دن عین مے نوشی کی صحبت میں سوداگر بچّے نے رونا شروع کیا، خواجہ نے دیکھتے ہی خاطر داری کی اور رومال سے آنسو پونچھنے لگا۔ اور سبب گریہ کا پوچھا۔ سوداگر بچّے نے کہا اے قبلہ! کیا کہوں؟ کاش کے تمہاری خدمت میں بندگی پیدا نہ کی ہوتی، اور یہ شفقت جو صاحب میرے حق میں کرتے ہیں نہ کرتے۔ اب دو مشکلیں میرے پیش آئی ہیں نہ تمہاری خدمت سے جدا ہونے کو جی چاہتا ہے اور نہ رہنے کا اتفاق یہاں ہو سکتا ہے۔ اب جانا ضرور ہوا، لیکن آپ کی جدائی سے اُمید زندگی کی نظر نہیں آتی۔

یہ بات سُن کر خواجہ بے اختیار ایسا رونے لگا کہ ہچکی بندھ گئی، اور بولا کہ اے نور چشم! ایسی جلدی اس اپنے بوڑھے خادم سے سیر ہوئے کہ اسے دل گیر کیے جاتے ہو؟ قصد روانہ ہونے کا دل سے دُور کرو، جب تلک میری زندگی ہے رہو، تمہاری جدائی سے ایک دم میں جیتا نہ رہوں گا، بغیر اجل

کے مر جاؤں گا۔ اور اس ملک فارس کی آب و ہوا بہت خوب اور موافق ہے،
بہتر تو یوں ہے کہ ایک آدمی معتبر بھیج کر اپنے والدین کو معہ اسباب یہیں بلوالو،
جو کچھ سواری اور بار برداری درکار ہو، میں موجود کروں جب ماں باپ تمہارے
اور گھر بار سب آیا، اپنی خوشی سے کاروبار تجارت کا کیا کرو۔ میں نے بھی اس
عمر میں زمانے کی بہت سختیاں کھینچی ہیں، اور ملک ملک پھرا ہوں۔ اب
بوڑھا ہوا، فرزند نہیں رکھتا، میں تجھے اپنے بیٹے سے سوا جانتا ہوں، اور اپنا
ولی عہد و مختار کرتا ہوں، میرے کارخانے سے بھی ہوشیار اور خبردار رہو۔ جب
تلک جیتا ہوں ایک ٹکڑا کھانے کو اپنے ہاتھ سے دو۔ جب مر جاؤں گا، داب
دیجو، اور سب مال و متاع میرا لیجو۔

تب سوداگر بچے نے جواب دیا کہ واقعی صاحب نے زیادہ باپ سے میری
غمخواری اور خاطرداری کی کہ مجھے ماں باپ بھول گئے، لیکن اس عاصی کے
والد نے ایک سال کی رخصت دی تھی، اگر دیر لگاؤں گا تو وے اس پیری
میں روتے روتے مر جائیں گے، پس رضامندی پدر کی خوشنودی خدا کی
ہے، اور اگر وہ مجھ سے ناراض ہوں گے تو میں ڈرتا ہوں کہ شاید دعائے بد
نہ کریں کہ دونوں جہان میں خدا کی رحمت سے محروم رہوں۔

اب آپ کی یہی شفقت ہے کہ بندے کو حکم کیجئے کہ فرمانا قبلہ گاہ کا بجا
لائے اور حق پدری سے ادا ہووے اور صاحب کی توجہ کا ادائے شکر جب
تلک دم میں دم ہے میری گردن پر ہے۔ اگر اپنے ملک میں بھی جاؤں گا تو
ہر دم دل و جان سے یاد کروں گا۔ خدا مسبب الاسباب ہے شاید پھر

کوئی ایسا سبب ہو کہ قدم بوسی حاصل کروں۔ غرض سوداگر بچے نے ایسی باتیں نون مرچیں لگا کر خواجہ کو سنائیں کہ وہ بچارا لاچار ہو کر ہونٹھ چاٹنے لگا۔ ازبسکہ اس پر شیفتہ اور فریفتہ ہو رہا تھا کہنے لگا اچھا، اگر تم نہیں رہتے تو میں ہی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ میں تجھ کو اپنی جان کے برابر جانتا ہوں، بس جب جان چلی جاوے تو خالی بدن کسی کام آوے؟ اگر تو اسی میں رضامند ہے تو چل اور مجھے بھی لے چل۔ سوداگر بچے سے یہ کہہ کر اپنی بھی تیاری سفر کرنے لگا۔ اور گماشتوں کو حکم کیا کہ باربرداری کی فکر جلدی کرو۔

جب خواجہ کے چلنے کی خبر مشہور ہوئی۔ وہاں کے سوداگروں نے سن کر سب نے نیت سفر کا کیا۔ خواجہ سگ پرست نے گنج اور جواہر بے شمار نوکر اور غلام انگنت تحفے اور اسباب شاہانہ بہت سا ساتھ لے کر شہر کے باہر تنبو اور قنات اور بیچوبے اور سراپردے اور کندلے کھڑے کر دا کر ان میں داخل ہوا۔ جتنے تجار تھے اپنی اپنی بساط موافق مال سوداگری کا لے کر ہم راہ ہوئے، برائے خود ایک لشکر ہو گیا۔

ایک دن جو گنی کو پیٹھ دے کر وہاں سے کوچ کیا، ہزاروں اونٹوں پر شیلیتے اسباب کے اور خچروں پر صندوق نقد جواہر کے لاد کر پانچ سو غلام دشت قبچاق اور زنگ و روم کے مسلح صاحب شمشیر تازی اور ترکی و عراقی و عربی گھوڑوں پر چڑھ کر چلے۔ سب کے پیچھے خواجہ اور سوداگر بچہ خلعت فاخرہ پہنے سکھپال پر سوار اور ایک تخت بغدادی اونٹ پر کسا اس پر کتا مسند پر سویا ہوا، اور ان دونوں قیدیوں کے قفس ایک شتر پر لٹکائے ہوئے روانہ ہوئے جس منزل

میں پہنچتے سب سوداگر خواجہ کی بارگاہ میں آکر حاضر ہوتے، اور دسترخوان پر کھانا کھانے اور شراب پیتے، خواجہ سوداگر بچے کے ساتھ ہونے کی خوشی میں شکر خدا کا کرتا اور کوچ در کوچ چلا جاتا تھا۔ بارے بخیر و عافیت نزدیک قسطنطنیہ کے آپہنچے۔ باہر شہر کے مقام کیا۔ سوداگر بچے نے کہا اے قبلہ! اگر رخصت دیجئے تو میں جا کر ماں باپ کو دیکھوں اور مکان صاحب کے واسطے خالی کروں۔ جب مزاج عالی میں آوے شہر میں داخل ہو جیے۔

خواجہ نے کہا تمہاری خاطر تو میں یہاں آیا، اچھا جلد مل جل کر میرے پاس آؤ اور اپنے نزدیک میرے اترنے کو مکان دو۔ سوداگر بچہ رخصت ہو کر اپنے گھر میں آیا سب وزیر کے محل کے آدمی حیران ہوئے کہ مرد کون گھس آیا سوداگر بچہ (یعنی بیٹی وزیر کی) اپنی ماں کے پاؤں پر جا گری اور روئی اور بولی، کہ میں تمہاری جائی ہوں سنتے ہی وزیر کی بیگم گالیاں دینے لگی کہ اے نٹری! تو بڑی شتاہو نکلی، اپنا منہ تو نے کالا کیا اور خاندان کو رسوا کیا، ہم تو تیری جان کو رو پیٹ کر صبر کر کے تجھ سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے جا دفع ہو۔

تب وزیر زادی نے سر پر سے پگڑی اتار کر پھینک دی اور بولی، اے اماں جان! میں بری جگہ نہیں گئی، کچھ بدی نہیں کی، تمہارے بموجب فرمانے کے بابا کو قید سے چھڑانے کی خاطر یہ سب فکر کی، الحمد للہ! کہ تمہاری دعا کی برکت سے اور اللہ کے فضل سے پورا کام کر کے آئی ہوں کہ نیشاپور سے اس سوداگر کو معہ کتے (جس کے گلے میں وے لعل پڑے ہیں) اپنے ساتھ لائی ہوں اور تمہاری امانت میں بھی خیانت نہیں کی۔ سفر کے لئے مردانہ بھیس کیا ہے، اب ایک روز کا کام

باقی ہے وہ کر کر قبلہ گاہ کو بنڈت خانے سے چھڑاتی ہوں اور اپنے گھر میں آتی ہوں اگر حکم ہو تو پھر جاؤں اور ایک روز باہر رہ کر خدمت میں آؤں ماں نے جب خوب معلوم کیا کہ میری بیٹی نے مردوں کا کام کیا اور اپنے تئیں سب طرح سلامت محفوظ رکھا ہے، خدا کی درگاہ میں ناک گھسنی کی، اور خوش ہو کر بیٹی کو چھاتی سے لگا لیا اور منہ چوما، بلائیں لیں دعائیں دیں اور رخصت کیا کہ تو جو مناسب جان سو کر، میری خاطر جمع ہوئی۔

وزیر زادی پھر سوداگر بچہ بن کر خواجہ سگ پرست کے پاس چلی وہاں خواجہ کو جدائی اس کی از بسکہ شاق ہوئی، بے اختیار ہو کر کوچ کیا۔ اتفاقاً نزدیک شہر کے ایدھر سے سوداگر بچہ جاتا تھا، اور ادھر سے خواجہ آتا تھا عین راہ میں ملاقات ہوئی۔ خواجہ نے دیکھتے ہی کہا۔ بابا مجھ بوڑھے کو اکیلا چھوڑ کر کہاں گیا تھا؟ سوداگر بچہ بولا آپ سے اجازت لے کر اپنے گھر گیا تھا، آخر ملازمت کے اشتیاق نے وہاں رہنے نہ دیا، آ کر حاضر ہوا۔ شہر کے دروازے پہ دریا کے کنارے ایک باغ سایہ دار دیکھ کر خیمہ استادہ کیا اور وہیں اترے۔ خواجہ اور سوداگر بچہ باہم بیٹھ کر شراب وکباب پینے لگے جب عصر کا وقت ہوا، سیر تماشے کی خاطر خیمے سے نکل کر صندلیوں پر بیٹھے۔ اتفاقاً ایک قراول بادشاہی ادھر آ نکلا، ان کا لشکر اور نشست برخاست دیکھ کر اچنبے ہو رہا اور دل میں کہا، شاید ایلچی کسو بادشاہ کا آیا ہے، کھڑا تماشہ دیکھتا تھا۔

خواجہ کے شاطر نے اس کو آگے بلایا اور پوچھا کہ تو کون ہے؟ اس نے کہا

میں بادشاہ کا میر شکار ہوں، شاطر نے خواجہ سے اس کا احوال کہا، خواجہ نے ایک غلام کافری کو کہا کہ جا کر بازدار سے کہہ کہ ہم مسافر ہیں۔ اگر جی چاہے تو آؤ بیٹھو، قہوہ قلیان حاضر ہے۔ جب میر شکار نے نام سوداگر کا سنا زیادہ متعجب ہوا، اور تبسم کے ساتھ خواجہ کی مجلس میں آیا، لوازم اور شان و شوکت اور سپاہ و غلام دیکھے۔ خواجہ اور سوداگر بچہ کو سلام کیا اور مرتبہ سگ کا نگاہ کیا، ہوش اس کے جاتے رہے۔ ہکا بکا سا ہو گیا۔ خواجہ نے اسے بٹھلا کر قہوے کی ضیافت کی۔ قراول نے نام و نشان خواجہ کا پوچھا۔ جب رخصت مانگی خواجہ نے کئی تھان اور کچھ تحفے اسے دے کر اجازت دی۔ صبح کو جب بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا، درباریوں سے خواجہ سوداگر کا ذکر کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ مجھ کو خبر ہوئی، میر شکار کو میں نے روبرو طلب کیا اور سوداگر کا احوال پوچھا۔

اس نے جو کچھ دیکھا تھا عرض کیا سننے سے کتے کے تجمل کے اور دو آدمیوں کے پنجڑے میں قید ہونے کے مجھ کو خفگی آئی میں نے فرمایا وہ مردود تاجر واجب القتل ہے۔ یسقچیوں کو حکم کیا کہ جلد جاؤ، اس بے دین کا سر کاٹ لاؤ۔ قضا کار وہی ایلچی فرنگ کا دربار میں حاضر تھا مسکرایا۔ مجھے اور بھی غضب زیادہ ہوا، فرمایا کہ اے بے ادب! بادشاہوں کے حضور میں بے سبب دانت کھولنے ادب سے باہر ہیں، بے محل ہنسنے سے رونا بہتر ہے۔ اس نے التماس کیا۔ جہاں پناہ! کئی باتیں خیال میں گذریں لہٰذا فدوی متبسم ہوا۔ پہلے یہ کہ وزیر سچا ہے اب قید خانے سے رہائی پاوے گا۔ دوسرے یہ کہ بادشاہ خون ناحق سے اس وزیر کے بچے،

تیسرے یہ کہ قبلہ عالم نے بے سبب اور بے تقصیر اُس سوداگر کو حکم قتل کا کیا۔ ان حرکتوں سے تعجب آیا کہ بے تحقیق ایک بے وقوف کے کہنے سے آپ ہر کسو کو حکم قتل کا کر بیٹھتے ہیں۔ خدا جانے فی الحقیقت اس خواجہ سگ کا احوال کیا ہے! اسے حضور میں طلب کیجئے اور اس کی واردات پوچھیے، اگر تقصیر وار ٹھہرے تب مختار ہو، جو مرضی میں آوے اس سے سلوک کیجئے۔

جب ایلچی نے اس طرح سمجھایا مجھے بھی وزیر کا کہنا یاد آیا، فرمایا جلد سوداگر کو اس کے بیٹے کے ساتھ اور وہ سگ اور قفس حاضر کرو۔ قورچی اس کے بلانے کو دوڑائے، ایک دم میں سب کو حضور میں لے آئے۔ روبرو طلب کیا۔ پہلے خواجہ اور اس کا پسر آیا، دونوں لباس فاخرہ پہنے ہوئے۔ سوداگر بچے کا جمال دیکھنے سے سب ادنیٰ اعلیٰ حیران اور بھیچک ہوئے۔ ایک خوان طلائی جواہر سے بھرا ہوا (کہ ہر ایک رقم کی چھوٹ نے سارے مکان کو روشن کر دیا) سوداگر بچہ ہاتھ میں لئے آیا، اور میرے تخت کے آگے نچھاور کیا، آداب کورنشات بجا لا کر کھڑا ہوا۔ خواجہ نے بھی زمین چومی اور دعا کرنے لگا، اس گویائی سے بولتا تھا کہ گویا بلبل ہزار داستاں ہے۔ میں نے اس کی لیاقت کو بہت پسند کیا لیکن عتاب کی رو سے کہا، اے شیطان آدمی کی صورت! تو نے یہ کیا جال پھیلایا ہے، اور اپنی راہ میں کنواں کھودا ہے؟ تیرا کیا دین ہے اور یہ کون آئین ہے؟ کس پیغمبر کی امت ہے؟ اگر کافر ہے تو بھی یہ کیسی مت ہے اور تیرا کیا نام ہے کہ تیرا یہ کام ہے؟

ان نے کہا قبلۂ عالم کی عمر و دولت بڑھتی رہے، غلام کا دین یہ ہے کہ خدا

واحد ہے اس کا کوئی شریک نہیں، اور محمد مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا کلمہ پڑھتا ہوں، اور اس کے بعد بارہ امام کو اپنا پیشوا جانتا ہوں اور آئین پیمبری یہ ہے کہ پانچوں وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور روزہ رکھتا ہوں اور حج بھی کر آیا ہوں، اور اپنے مال سے خمس زکوٰۃ دیتا ہوں اور مسلمان کہاتا ہوں۔ لیکن ظاہر میں یہ سارے عیب جو مجھ میں بھرے ہیں جن کے سبب سے آپ ناخوش ہوئے ہیں اور تمام خلق اللہ میں بدنام ہو رہا ہوں، اس کا ایک باعث ہے کہ ظاہر نہیں کر سکتا۔ ہر چند سگ پرست مشہور ہوں اور مضاعف محصول دیتا ہوں یہ سب قبول کیا ہے، پر دل کا بھید کسو سے نہیں کہا۔ اس بہانے سے میرا غصہ زیادہ ہوا اور کہا مجھے تو باتوں میں پھسلاتا ہے، میں نہیں ماننے کا جب تلک اس اپنی گمراہی کی دلیل معقول عرض نہ کرے کہ میرے دل نشین ہو، تب تو جان سے بچے گا نہیں تو اس کے قصاص میں تیرا پیٹ چاک کراؤں گا، تو سب کو عبرت ہو کہ پھر دیگر کوئی دین محمدی میں رخنہ نہ کرے۔

خواجہ نے کہا، اے بادشاہ! مجھ کم بخت کے خون سے در گذر کر، اور جتنا مال میرا ہے کہ گنتی اور شمار سے باہر ہے سب کو ضبط کرلے، اور مجھے اور میرے بیٹے کو اپنے تخت کے تصدق کر کر چھوڑ دے اور جاں بخشی کر۔ میں نے تبسم کر کے کہا، اے بے وقوف! اپنے مال کی طمع مجھے دکھاتا ہے سوائے سچ بولنے کے اب تیری مخلصی نہیں۔ یہ سنتے ہی خواجہ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپکنے لگے، اور اپنے بیٹے کی طرف دیکھ کر ایک آہ بھری اور بولا،

ہیں تو پادشاہ کے روبرو گنہ گار ٹھہرا، مارا جاؤں گا، اب کیا کروں؟ تجھے کس کو سونپوں؟ میں نے ڈانٹا کہ اے مکار، بس اب عذر بہت کئے، جو کہنا ہے جلدی کہہ۔

تب تو اس مرد نے قدم بڑھا کر تخت کے پاس آ کر پائے کو بوسہ دیا اور صفت و ثنا کرنے لگا اور بولا، اے شہنشاہ! اگر حکم قتل کا میرے حق میں نہ ہوتا تو سب سیاستیں سہتا اور اپنا ماجرا نہ کہتا۔ لیکن جان سب سے عزیز ہے، کوئی آپ سے کنوئیں میں نہیں گرتا۔ پس جان کی محافظت واجب ہے، اور ترک واجب کا خلاف حکم خدا کے ہے۔ خیر جو مرضی مبارک یہی ہے تو سرگذشت اس پیر ضعیف کی سنئے۔ پہلے حکم ہو کہ وہ دونوں قفس جن میں دو آدمی قید ہیں حضور میں لا کر رکھیں۔ میں اپنا احوال کہتا ہوں، اگر کہیں جھوٹ کہوں تو ان سے پوچھ کر مجھے قائل کیجئے اور انصاف فرمائیے۔

رقعاتِ غالب

(۱) چودھری عبدالغفور کے نام

میرے مشفق آپ کا خط آیا اور اس کے آنے نے تمہاری رنجش کا وسوسہ میرے دل سے مٹایا۔ ایک قاعدہ آپ کو بتاتا ہوں اگر اس کو منظور کیجئے گا تو خطوط کے نہ پہنچنے کا احتمال اُٹھ جائے گا اور رجسٹری کا دردِ سر جاتا رہے گا۔ آدھ آنہ نہ سہی ایک آنہ سہی آپ بھی خط بیرنگ بھیجا کیجئے اور میں بھی بیرنگ بھیجا کروں پیڈ خطوط تلف بھی ہوتے ہیں۔ اس قاعدہ کا جیسا کہ میں واضع ہوا ہوں بادی بھی ہوا اور یہ خط بیرنگ بھیجا پنشن جاری ہو گیا تین برس کا چڑھا ہوا روپیہ مل گیا بعد ادائے قرض ۱۱ عہ بچے اب ماہ بماہ روپیہ ملتا ہے مگر بھی تین مہینے ستمبر۔ اکتوبر۔ نومبر ملیں گے ستمبر ۱۸۶۰ء سے تنخواہ ششماہی ہو جائے گی۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ چار روپیہ سیکڑہ سالانہ عمداً وضع ہوا کرے گا۔ اس حساب سے میرے حصہ میں ڈھائی روپیہ مہینہ آیا ۹ عہ کے ساٹھ رہیں گے کچھ رامپور سے ماہ بماہ آتا ہے۔ یہ دونوں آمدنیں مل کر خوش و ناخوش گزارا ہو جاتا ہے۔ یہاں شہر ڈھہ رہا ہے بڑے بڑے نامی بازار خاص بازار اور اردو بازار اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا اب پتہ بھی نہیں کہ کہاں تھے۔ صاحبانِ امکنہ و دکاکین نہیں بتا سکتے

کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور دوکان کہاں تھی۔ برسات بھر مینھ نہیں برسا۔ اب تیشہ
اور کلنار کی طغیانی سے مکانات گر گئے غلہ گراں ہے موت ارزاں ہے۔ میوہ
کے مول اناج بکتا ہے۔ ماش کی دال ۸ سیر باجرہ ۱۲ سیر گیہوں ۱۳ سیر چنے
۱۶ سیر گھی ۱۰ سیر ترکاری مہنگی۔ ان سب باتوں سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ
کنوار کا مہینہ جیسے جاڑے کا دوار کہتے ہیں پانی گرم۔ دھوپ تیز اور لو چلتی ہے
جیٹھ اساڑھ کی سی گرمی پڑتی ہے حضرت رفعت درجت جناب صاحب
کی خدمت میں دوستانہ سلام اور مریدانہ بندگی بانکسار تمام عرض کرتا
ہوں۔ حضرت کو کس راہ سے میرے آنے کا انتظار ہے میں نے مرشد زادہ
کے خط میں کب اپنا عزم لکھا یا کسی نے آپ سے میری زبانی کہا کہ آپ
روز روانگی کے تقرر سے اطلاع چاہتے ہیں۔ ہاں آپ کی قدمبوسی کی
تمنا اور انوار الدولہ کے دیدار کی آرزو حد سے زیادہ ہے اور ایسا جانتا
ہوں کہ یہ آرزو گور میں لے جاؤں گا تنخواہ کے اجرا کا حال اور مستقبل میں
اس کے وصول کی صورت اُن سطروں سے جو آغاز مکتوب میں چودھری
عبدالغفور صاحب کی خدمت میں لکھی گئی ہے مع روداد شہر معلوم کر لیجئے
گا۔ لالہ گوبند پرشاد صاحب ہنوز میرے پاس نہیں آئے ہیں۔ دنیادار
نہیں فقیر خاکسار ہوں تواضع میرے خو ہے۔ انجاح مقاصد خلق میں
حتی الوسع کمی کروں تو ایمان نصیب نہ ہو۔ انشاء اللہ العزیز وہ فقیر سے
راضی و خوشنود رہیں گے جناب مستطاب حضرت محمد امیر صاحب کی
خدمت میں بعد سلام دعا نیاز یہ گزارش ہے کہ میرے پاس حضرت کا سلام

پیام سوائے اب کی بار کے کبھی نہیں پہنچا۔ اب ان سطور کو اپنا ذریعہ افتخار سمجھا اور نوید مقدم مبارک سے بہت خوش ہوا یہ جو خانہ کوچی و گریز پائی اور بے اطمینان کا آپ کو مجھ پر گمان ہے اور اس کا رنج ہے۔ یہ خلاف واقع کسی نے آپ سے کہا ہے۔ بس مع زن و فرزند ہر وقت اسی شہر میں قلزم خون کا شناور ہو رہا ہوں۔ دروازہ سے قدم باہر نہیں رکھا نہ پکڑا نہ قید ہوا نہ مارا گیا۔ کیا عرض کروں کہ میرے خدا نے مجھ پر کیسی عنایت کی اور کیا نفس مطمئنہ بخشا۔ جان و مال و آبرو میں کسی طرح کا فرق نہیں آیا تنخواہ جس کو حضرت نے یومیہ لقب دیا ہے اس کا حال اوپر کی تحریر سے دریافت ہو گا۔ فقیر کو اپنا دوست اور معتقد اور مشتاق تصور فرماتے رہیے گا۔ مرشد زادہ مرتضوی دودمان سید شاہ عالم کو سلام و دعا۔ ڈپٹی صاحب سے مجھ سے ملاقات کثرت سے نہیں ہے ان کو کثرت اشغال سے فرصت نہیں مجھ کو افراط ضعف سے طاقت نہیں اگر بحسب اتفاق کہیں ملاقات ہو گئی تو آپ کا سلام کہہ دوں گا۔ آپ اپنے اخوان عالی شان کو میرا سلام پہنچا دیجیے گا۔

بندۂ شاہ شمایم و ثنا خوانِ شما

(۲) بنام میر مہدی مجروح

جانِ غالب! تمہارا خط پہنچا۔ غزل اصلاح کے بعد پہنچتی ہے مگر
ہر ایک سے پوچھتا ہوں وہ کہاں ہے

مصرع بدل دینے سے یہ شعر کس رتبہ کا ہو گیا۔ اے میر مہدی تجھے شرم نہیں آتی۔ میاں یہ اہلِ دہلی کی زبان ہے۔ ارے اب اہلِ دہلی ہندو ہیں یا اہلِ حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے۔ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا، ریاست تو جاتی رہی باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں۔ خس کی ٹٹی پروا ہوا اب کہاں؟ وہ لطف تو اسی مکان میں تھا۔ اب میر خیراتی کی حویلی میں وہ چھت اور سمت بدلی ہوئی ہے۔ بہر حال میگذرد۔ مصیبت عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں بند ہو گیا۔ لال ڈگی کے کنوئیں یک قلم کھاری ہو گئے۔ خیر کھاری ہی پانی پیتے گرم پانی نکلتا ہے پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازہ تک بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو ہُو کا مکان ہو جائے۔ یاد کرو مرزا گوہر کے باغیچہ کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا۔ اب وہ باغیچہ کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہتے ہیں۔ باقی سب اٹ گیا۔ کشمیری دروازہ کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازہ سے کابلی دروازہ تک

میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرہ، دھوبی واڑہ، رامجی گنج۔ سعادت خاں کا کٹرہ۔ جرنیل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا تھا اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ اللہ دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حسنِ اعتقاد ارے بندۂ خدا اردو بازار نہ رہا اردو کہاں۔ دلی کہاں۔ واللہ اب شہر نہیں ہے کیمپ ہے۔ چھاونی ہے۔ نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر۔ الور کا حال کچھ اور ہے مجھے اور انقلاب سے کیا کام۔ الگزنڈر ہڈرلی کا کوئی خط نہیں آیا ظاہرا اُن کی مصاحبت نہیں ورنہ مجھ کو ضرور خط لکھتا رہتا۔ میر سرفراز حسین اور میرن صاحب اور نصیر الدین کو دعا۔

(۳) ایضاً

بھائی تم سچ کہتے ہو۔ع برہر فرزند آدم ہرچہ آید بگذرد۔ لیکن مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ یہ زیر باری میری تحریر کے بھروسے پر ہوئی اور خلاف میری مرضی کے ہوئی۔ جس طرح یہ آئے ہیں اگرچہ میری طبیعت اور میری خواہش کے منافی ہے لیکن واللہ میرے عقیدہ اور تصور اور قیاس کے مطابق ہے یعنی میں بھی سمجھا تھا کہ البتہ یوں ہی ہوگا۔ دیوان اُردو چھپ چکا ہے۔ لکھنؤ کے چھاپے خانے نے جس کا دیوان چھاپا اُس کو آسمان پر چڑھا دیا۔ حُسن خط سے الفاظ کو چمکا دیا۔ دلّی پر اور اُس کے بانی پر اور اس کے چھاپے پر لعنت۔ صاحب دیوان کو اس طرح یاد کرنا جیسے کوئی کتّے کو آواز دے۔ ہر کاپی دیکھتا رہا ہوں، کاپی نگار اور تھا متوسط، جو کاپی میرے پاس لایا کرتا تھا وہ اور تھا اب جو دیوان چھپ چکے حق التصنیف ایک مجھ کو ملا۔ غور کرتا ہوں تو وہ الفاظ جوں کے توں ہیں یعنی کاپی نگار نے نہ بنائے ناچار غلط نامہ لکھا وہ چھپا۔ بہر حال خوش و ناخوش کئی جلدیں مول لوں گا اگر خدا چاہے تو اسی ہفتہ میں تین مجلد اصحاب ثلثہ کے پاس پہنچ جائیں۔ میں خوش ہوا ہوں نہ تم خوش ہو گے اور یہ جو لکھتے ہو کہ یہاں خریدار ہیں قیمت لکھ بھیجو۔ میں دلال نہیں۔ سوداگر نہیں، مہتمم مطبع نہیں۔ مطبع احمدی کے مالک محمد حسین خاں، مہتمم مرزا اموجان مطبع شاہدرہ میں۔ محمد حسین خاں دلی شہر رائے مان کے کوچہ میں مصوروں کی حویلی کے پاس قیمت کتاب۔

چھ آنے محصول ڈاک خریدار کے ذمہ۔ طالبان کتاب کو اطلاع دو۔ دو چار دس پانچ جلدیں جس کو منگانی ہوں محمد حسین خاں کے نام پر دلی راج مان کے کوچے مصوروں کی حویلی کا پتا لکھ کر خط ڈاک میں بھجوا دو۔ کتاب ڈاک میں پہنچ جائے گی۔ قیمت چاہو نقد چاہو ٹکٹ ارسال کرو۔ مجھ کو اور تم کو کیا جو کہے اُس کو یہ جواب دے دو۔ وبا تھی کہاں جو میں لکھوں کہ اب کم ہے یا زیادہ ایک چھیاسٹھ برس کا مرد، ایک چونسٹھ برس کی عورت ان دو میں سے ایک بھی مرتا تو ہم جانتے کہ ہاں وبا آئی تھی۔ تف بریں وبا۔ پنجشنبہ ۸ ماہ اگست کے مہینے کا حال کچھ معلوم نہیں۔ کل شام کو دو دو مونڈھے رکھکر کئی آدمی دیکھا کئے ہلال نظر نہیں آیا۔

نجات کا طالب غالبؔ

(۴) بنام منشی ہرگوپال تفتہ

دکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

بندہ پرور! پہلے تم کو یہ لکھا جاتا ہے کہ میرے دوست قدیم میر کرم حسین

صاحب کی خدمت میں میرا سلام کہنا اور یہ کہنا اب تک جیتا ہوں اور اس سے زیادہ میرا حال مجھ کو بھی معلوم نہیں۔ مرزا حاتم علی صاحب مہر کی جناب میں میرا سلام کہنا اور یہ میرا شعر میری زبان سے پڑھنا ؎

شرط اسلام بود ورزشِ ایماں بالغیب
اے تو غائب زنظر مہر تو ایمان من ست

تمہارے پہلے خط کا جواب بھیج چکا تھا کہ اس کے دو دن یا تین دن کے بعد دوسرا خط پہنچا۔ سنو صاحب! جس شخص کو جس شغل کا ذوق ہو اور وہ اس میں بے تکلف عمر بسر کرے اس کا نام عیش ہے۔ تمہاری توجہ مفرط بطرف شعر و سخن۔ تمہاری شرافت نفس اور حسن طبع کی دلیل ہے اور بھائی یہ جو تمہاری سخن گستری ہے اس کی شہرت میں میری بھی تو نام آوری ہے۔ میرا حال اس فن میں اب یہ ہے کہ شعر کہنے کی روش اور اگلے کہے ہوئے اشعار سب بھول گیا۔ مگر ہاں اپنے ہندی کلام میں ڈیڑھ شعر یعنی ایک مقطع اور ایک مصرع یاد رہ گیا ہے سو گاہ گاہ جب دل الٹنے لگتا ہے تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آ جاتا ہے ؎

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ   ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں تو یہ مصرع پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں۔ ع   اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں جو دکھ مجھ کو

ہے اس کا بیان تو معلوم ہو گیا مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریز کی قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے اس میں کوئی میرا اُمید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو زیست کیوں کر نہ دشوار ہو ہائے اتنا یار مرے کہ جواب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُوْن۔

غالب

(۵) ایضاً

دیکھو صاحب! یہ باتیں ہم کو پسند نہیں ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو اور مزہ یہ ہے کہ جب تم سے کہا جائے گا تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے۔ لطف اس میں ہے کہ میں سچا اور تم بھی سچے۔ آج تک رائے امید سنگھ یہیں ہیں اور ابھی نہیں جائیں گے۔ تمہارا مدعا حاصل ہو گیا ہے جس دن وہ آئے تھے اسی دن مجھ سے کہہ گئے تھے۔ میں بھول گیا اور اُس خط میں تم کو نہ لکھا۔ صاحب وہ فرماتے تھے کہ میں نے کئی مجلد مرزا تفتہ کے دیوان کے اور کئی نسخے تضمین اشعار گلستاں کے اُن کے خواہش کے بموجب کوئی پارسی ہے بمبئی میں اس کے پاس بھیج دیئے ہیں یقین ہے کہ وہ ایران کو ارسال کرے گا۔ امید سنگھ نے اس پارسی کا نام بھی لیا تھا، میں بھول گیا۔

اب جو تم کو اس خیال میں مبتلا پایا تو ان کا بیان مجھ کو یاد آیا۔ جانتا ہوں کہ وہ
کہاں رہتے ہیں۔ دو بار ان کے گھر گیا بھی ہوں مگر محلہ کا نام نہیں جانتا
نہ میرے آدمیوں میں سے کوئی جانتا ہے۔ اب کسی جاننے والے سے پوچھ کر
تم کو لکھ بھیجوں گا۔ میر بادشاہ صاحب سے عندالملاقات میری دعا کہہ دینا۔
لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہ لکھنے کے قابل بات پھر بھول گیا۔ کل
میر کرامت علی صفا تخلص کہ میں نے آگے ان کو کبھی نہیں دیکھا تھا ناگاہ مجھ
سے آکر ملے اور تمہارا حال پوچھتے رہے میں نے کہہ دیا کہ بخیر و عافیت سکندر آباد
میں ہیں۔ جب میں نے ان سے کہا کہ کیا وہ تمہارے آشنا ہیں انھوں نے کہا
صاحب وہ بزرگ اور استاد ہیں میں اُن کا شاگرد ہوں کہیں مدرسہ کے
علاقوں میں نوکر ہیں بسبیل ڈاک آئے تھے اور آج ہی بسبیل ڈاک انبالہ کو
گئے۔ انبالہ ان کا وطن ہے اور نوکر بھی وہ اسی ضلع میں ہیں۔

غالب نگاشتہ دوشنبہ ۳ جنوری ۱۸۵۹ء

(۶) بنام نواب انوار الدولہ

پیر و مرشد! ۱۲ بجے تھے، میں ننگا اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا حقّہ پی رہا تھا کہ
آدمی نے آکر خط دیا، میں نے کھولا، پڑھا، بھلے کو انگرکھا کرتا گلے میں نہ تھا۔
اگر ہوتا تو میں گریبان پھاڑ ڈالتا حضرت کا کیا جاتا، میرا نقصان ہوتا۔ میرے
سے سنئے، آپ کا قصیدہ بعد اصلاح بھیجا۔ اُس کی رسید آئی۔ کیئی کٹے ہوئے
شعر لے کے آئے۔ ان کی قباحت پوچھی گئی قباحت بتائی گئی، الفاظ قبیح کی جگہ

بے عیب الفاظ لکھ دیئے گئے تو صاحب یہ اشعار بھی قصیدے میں لکھ لو،
اس نگارش کا جواب آج تک نہیں آیا شاہ اسرار الحق کے نام کا کاغذ اُن
کو دیا، جواب میں جو کچھ انھوں نے زبانی فرمایا آپ کو لکھا گیا۔ حضرت کی طرف
سے اس تحریر کا بھی جواب نہ ملا ؎

پڑھوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑ دیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

سوچتا ہوں کہ دونوں خط بیرنگ گئے تھے، تلف ہونا کسی طرح متصور نہیں،
خیر اب بہت دن کے بعد شکوہ کیا لکھا جائے۔ باسی کڑھی میں اُبال کیوں
آئے۔ بندگی بے چارگی، پانچ لشکر کا حملہ پے درپے اس شہر پر ہوا، پہلا
باغیوں کا لشکر اُس میں اہل شہر کا اعتبار لٹا، دوسرا لشکر خاکیوں کا اس
میں جان و مال و ناموس و مکان و مکین، و آسمان و زمین و آثار ہستی سراسر لٹ
گئے۔ تیسرا لشکر کال کا، اُس میں ہزار ہا آدمی بھوکے مرے۔ چوتھا لشکر ہیضے
کا اُس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے پانچواں لشکر تپ کا، اس میں تاب
و طاقت عموماً لٹ گئی مرے آدمی کم لیکن جس کو تپ آئی اُس نے پھر اعضا
میں طاقت نہ پائی۔ اب تک اس لشکر نے شہر سے کوچ نہیں کیا۔ میرے گھر میں
دو آدمی تپ میں مبتلا ہیں ایک بڑا لڑکا اور ایک میرا داروغہ، خدا اُن دونوں
کو جلد صحت دے۔ برسات یہاں بھی اچھی ہوئی ہے لیکن نہ ایسی کہ جیسی کالپی
اور بنارس میں، زمیندار خوش، کھیتیاں تیار ہیں، خریف کا بڑا ہار ہے، ربیع
کے واسطے پوہ ماہ میں مینھ درکار ہے۔ کتاب کا پارسل پرسوں ارسال کیا

جائے گا۔

اہاہا ہا۔ جناب حافظ محمد بخش صاحب! میری بندگی مغل علی خاں غدر سے کچھ دن پہلے مستسقی ہو کر مر گئے۔ ہے ہے کیوں کر لکھوں حکیم رضی الدین خاں کو قتل عام میں ایک خاکی نے گولی مار دی اور احمد حسین خاں اُن کے چھوٹے بھائی بھی اُسی دن بیچلے گئے۔ طالع یار خاں کے دونوں بیٹے ٹونک سے رخصت لے کر آئے تھے، غدر کے سبب جا نہ سکے یہیں رہے، بعد فتح دہلی دونوں بے گناہوں کو پھانسی ملی، طالع یار خاں ٹونک میں ہیں زندہ ہیں پر یقین ہے کہ مردے سے بدتر ہوں گے۔ میر چھوٹم نے بھی پھانسی پائی۔ حال صاحب زادہ میاں نظام الدین کا یہ ہے کہ جہاں سب اکابر شہر کے بھاگے تھے وہاں وہ بھی بھاگ گئے تھے بڑودے میں رہے۔ اورنگ آباد میں رہے، حیدر آباد میں رہے۔ سال گذشتہ یعنی جاڑوں میں یہاں آئے۔ سرکار سے ان کی صفائی ہو گئی۔ لیکن صرف جاں بخشی۔ روشن الدولہ کا مدرسہ جو عقب کوتوالی چبوترہ ہے وہ اور خواجہ قاسم کی حویلی جس میں مغل علی خاں مرحوم رہتے تھے وہ اور خواجہ صاحب کی حویلی، یہ املاک خاص حضرت کالے صاحب کی اور کالے صاحب کے بعد میاں نظام الدین کی قرار پا کر ضبط ہو گئی اور نیلام ہو کر روپیہ سرکار میں داخل ہو گیا۔ ہاں قاسم خاں کی حویلی جس کے کاغذ میاں نظام الدین کی والدہ کے نام ہیں وہ اُن کو یعنی میاں نظام الدین کی والدہ کو مل گئی ہے۔ فی الحال میاں نظام الدین پاک پٹن گئے ہیں۔ شاید بھاول پور بھی جائیں گے۔

(۷) بنام مرزا علاء الدین خاں

سنو! عالم دو ہیں، ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب و گل، حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ اور پھر آپ جواب دیتا ہے لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَہَّارِ۔ ہر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں۔ لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہ گار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں چنانچہ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کو مجھ کو روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا۔ ۱۳ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ ہجری کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔ فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا، برسوں کے بعد میں جیل خانے سے بھاگا تین برس بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا، پایان کار مجھے کلکتے سے پکڑ لائے اور پھر اسی مجلس میں بٹھا دیا، جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار مشقت مقرری اور مشکل ہو گئی۔ طاقت یک قلم زائل ہو گئی۔ بے حیا ہوں سال گذشتہ بیڑی کو زاویہ زنداں میں چھوڑ مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ، مراد آباد ہوتا ہوا رامپور پہنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑ آیا، اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں کیا۔ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکم رہائی دیکھئے کب صادر ہو۔ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اسی ماہ ذی الحجہ

۱۲۷۷ھ ہجری میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا، میں بھی بعد نجات سیدھا عالم ارواح کو چلا جاؤں گا۔

گُذرا ہوا زمانہ

برس کی آخیر رات کو ایک بڈھا اپنے اندھیرے گھر میں اکیلا بیٹھا ہے۔ رات بھی ڈراؤنی اور اندھیری ہے۔ گھٹا چھا رہی ہے۔ بجلی تڑپ تڑپ کر کڑکتی ہے۔ آندھی بڑے زوروں سے چلتی ہے۔ دِل کانپتا ہے اور دم گھبراتا ہے۔ بڈھا نہایت غمگین ہے۔ مگر اُس کا غم نہ اندھیرے گھر پر ہے، نہ اکیلے پن پر اور نہ اندھیری رات اور بجلی کی کڑک اور اندھی کی گونج پر اور نہ برس کی آخیر رات پر۔ وہ اپنے پچھلے زمانہ کو یاد کرتا ہے اور جتنا ہی زیادہ یاد آتا ہے۔ اُتنا ہی غم بڑھتا ہے۔ ہاتھوں سے ڈھکے ہوئے مُنہ پر آنکھوں سے آنسو بہے چلے جاتے تھے۔

پچھلا زمانہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھرتا ہے۔ اپنا لڑکپن اس کو یاد آتا ہے، جب کہ اس کو کسی چیز کا غم اور کسی بات کی فِکر دل میں نہ تھی روپیہ اشرفی کے بدلے ریوڑی اور مٹھائی اچھی لگتی تھی سارا گھر ماں و باپ، بھائی بہن اس کو پیار کرتے تھے۔ پڑھنے کے لئے چھٹی کا وقت جلد آنے کی خوشی میں کتابیں بغل میں لئے مکتب میں چلا جاتا تھا۔ مکتب کا خیال آتے ہی اس کو اپنے ہم مکتب یاد آتے تھے۔ وہ اور زیادہ غمگین ہوتا تھا اور بے اختیار چلا اُٹھتا تھا "ہائے وقت! ہائے وقت!

ہائے گذرے ہوئے زمانے افسوس! میں نے تجھے بہت دیر میں یاد کیا۔

پھر وہ اپنی جوانی کا زمانہ یاد کرتا تھا۔ اپنا سُرخ و سفید چہرہ سڈول ڈیل بھرا بھرا بدن، رسیلی آنکھیں۔ موتی کی لڑی سے دانت، اُمنگ میں بھرا ہوا دِل جذبات انسانی کے جوشوں کی خوشی اسے یاد آتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھائے ہوئے زمانہ میں ماں باپ جو نصیحت کرتے تھے اور نیکی اور خداپرستی کی بات بتاتے تھے۔ اور یہ کہتا تھا کہ "آہ ابھی بہت وقت ہے" اور بڑھاپے آنے کا کبھی خیال بھی نہ کرتا تھا۔ اس کو یاد آتا تھا اور افسوس کرتا تھا کہ کیا اچھا ہوتا اگر جب ہی میں اس وقت کا خیال کرتا اور خداپرستی اور نیکی سے اپنے دل کو سنوارتا اور موت کے لئے تیار رہتا! آہ وقت گذر گیا! آہ وقت گذر گیا! اب پچھتائے کیا ہوتا ہے۔ افسوس میں نے اپنے تئیں ہمیشہ یہ کہہ کر برباد کیا کہ ابھی وقت بہت ہے"!

یہ کہکر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹٹول ٹٹول کر کھڑکی تک آیا۔ کھڑکی کھولی دیکھا۔ کہ رات ویسی ہی ڈراؤنی ہے۔ اندھیری گھٹا چھا رہی ہے بجلی کڑک سے دل بھٹا جاتا ہے۔ ہولناک آندھی چل رہی ہے۔ درختوں کے پتے اُڑتے ہیں۔ تب وہ چلا کر بولا "ہائے! ہائے! میری گذری ہوئی زندگی بھی ایسی ہی ڈراونی ہے۔ جیسی یہ رات"۔ یہ کہکر پھر اپنی جگہ آبیٹھا۔

اتنے میں اس کو اپنی ماں، باپ، بھائی، بہن، دوست، آشنا یاد آئے جن کی ہڈیاں قبروں میں گل کر خاک ہوچکی تھیں۔ ماں گویا محبت سے اس کو چھاتی سے لگائے آنکھوں میں آنسو بھرے کھڑی ہے۔ یہ کہتی ہوئی

کہ "ہائے بیٹا! وقت گذر گیا" باپ کا نورانی چہرہ اس کے سامنے ہے اور اُس میں سے یہ آواز آتی ہے کہ "کیوں بیٹا! ہم تمہارے ہی بھلے کے لئے نہ کہتے تھے؟" بھائی بہن دانتوں میں اُنگلی دبائے ہوئے خاموش ہیں۔ اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہے، دوست آشنا سب غمگین کھڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ "اب ہم کیا کر سکتے ہیں"

ایسی حالت میں اس کو اپنی وہ باتیں یاد آتی تھیں جو اس نے نہایت بے پروائی اور بے مروّتی اور کج خلقی سے اپنے ماں، باپ، بھائی، بہن دوست آشنا کے ساتھ برتی تھیں۔ ماں کو رنجیدہ رکھنا، باپ کو ناراض کرنا، بھائی بہن سے بے مروّت رہنا، دوست آشنا کے ساتھ ہمدردی نہ کرنا یاد آتا تھا اور اُس پر اُن گلی ہوئی ہڈیوں میں ایسی محبت کا دیکھنا اُس کے دل کو پاش پاش کرتا تھا۔ اُس کا دم چھاتی میں گھٹا چلا جاتا تھا اور یہ کہہ کر چلا اٹھتا تھا کہ "ہائے وقت نکل گیا! ہائے وقت نکل گیا! اب کیونکر اس کا بدلا ہو؟"

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا اور ٹکراتا، لڑکھڑاتا کھڑکی کی طرف پہنچا اس کو کھولا۔ اور دیکھا کہ ہوا ٹھہری ہے اور بجلی کی کڑک کچھ تھمی ہے۔ پر رات ویسی ہی اندھیری ہے۔ اس کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی اور پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اتنے میں اس کو اپنا ادھیڑپن یاد آیا۔ جس میں نہ وہ جوانی رہی تھی اور نہ وہ جوانی کا جوبن۔ نہ دل رہا تھا۔ نہ دل کے ولولوں کا جوش۔

اس نے اپنی اس نیکی کے زمانہ کو یاد کیا۔ جس میں بہ نسبت بدی کے نیکی کی طرف زیادہ مائل تھا۔ وہ اپنا روزہ رکھنا۔ نمازیں پڑھنی، حج کرنا، زکوٰۃ دینی۔ بھوکوں کو کھلانا، مسجدیں اور کنوئیں بنوانا یاد کرکر کے اپنے دل کو تسلی دیتا تھا۔ فقیروں اور درویشوں کو جن کی خدمت کی تھی، اپنے پیروں کو جن سے بیعت کی تھی، اپنی مدد کو پکارتا۔ مگر دل کی بیقراری نہیں جاتی تھی۔ وہ دیکھتا تھا کہ اس کے ذاتی اعمال کا اسی تک خاتمہ ہے۔ بھوکے پھر ویسے ہی بھوکے ہیں، مسجدیں ٹوٹ کر یا تو کھنڈر ہیں یا پھر ویسے ہی جنگل ہیں کنوئیں اندھے پڑے ہیں۔ نہ پیر اور نہ فقیر کوئی اس کی آواز نہیں سنتا اور نہ مدد کرتا ہے۔ اس کا دل بہت گھبراتا ہے اور سوچتا ہے کہ میں نے کیا کیا؟ جو تمام فانی چیزوں پر دل لگایا۔ پچھلی سمجھ پہلے ہی کیوں نہ سوجھی؟ اب کچھ بس نہیں چلتا۔ اور پھر یہ کہکر چلا اٹھا "ہائے وقت! ہائے وقت! میں نے تجھ کو کیوں کھویا!"

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا اس کے پٹ کھولے۔ تو دیکھا کہ آسمان صاف ہے۔ آندھی تھم گئی۔ گھٹا کھل گئی ہے۔ تارے نکل آئے ہیں ان کی چمک سے اندھیرا بھی کچھ کم ہو گیا ہے۔ وہ دل بہلانے کے لئے تاروں بھری رات کو دیکھ رہا تھا۔ یکایک اس کو آسمان کے بیچ میں ایک روشنی دکھائی دی اور اس میں ایک خوبصورت دلہن نظر آئی اس نے ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنا شروع کیا۔ جوں جوں اسے دیکھتا تھا وہ قریب ہوتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اس کے بہت پاس

آگئی۔ وہ اس کے حسن وجمال کو دیکھ کر حیران ہو گیا اور نہایت پاک دل اور محبت کے لہجے سے اس سے پوچھا کہ "تم کون ہو؟" وہ بولی کہ "میں ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی ہوں"۔ اس نے پوچھا کہ "تمہاری تسخیر کا بھی کوئی عمل ہے؟" وہ بولی "ہاں ہے"۔ "نہایت آسان پر بہت مشکل۔ جو کوئی خدا کا فرض ادا کرے انسان کی بھلائی اور اس کی بہتری میں سعی کرے۔ اس کی میں مسخر ہوتی ہوں"۔ "دنیا میں کوئی چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے۔ انسان ہی ایسی چیز ہے جو آخیر تک رہے گا بس جو بھلائی کہ انسان کی بہتری کے لئے کی جاتی ہے۔ وہی نسل در نسل آخیر تک چلی آتی ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ۔ اسی تک ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی موت ان چیزوں کو ختم کر دیتی ہے۔ مادّی چیزیں بھی چند روزہ ہیں، فنا ہو جاتی ہیں۔ مگر انسان کی بھلائی آخیر تک جاری رہتی ہے۔ میں تمام انسان کی روح ہوں جو مجھ کو تسخیر کرنا چاہے۔ انسان کی بھلائی میں کوشش کرے"۔ یہ کہکر وہ دلہن غائب ہو گئی اور بڈھا پھر اپنی جگہ آبیٹھا۔

اب پھر اس نے اپنا پچھلا زمانہ یاد کیا اور دیکھا کہ اس نے اپنی پچپن برس کی عمر میں کوئی کام بھی انسان کی بھلائی کا نہیں کیا تھا اس کے تمام کام ذاتی غرض پر مبنی تھے۔ نیک کام جو کئے تھے ثواب کے لالچ اور گویا خدا کو رشوت دینے کی نظر سے کئے تھے۔ خاص انسانی بھلائی کی خالص نیت سے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

اپنا حال سوچ کر وہ اس دلفریب دلہن کے ملنے سے مایوس ہوا۔

اپنا اخیر زمانہ دیکھ کر آئندہ کرنے کی بھی کچھ امید نہ پائی تب نہایت مایوسی کی حالت میں بے قرار ہو کر چلا اٹھا "ہائے وقت! کیا پھر تجھے میں بلا سکتا ہوں۔ میں دس ہزار دینار دیتا اگر پھر آتا۔ اور میں جوان ہو سکتا" یہ کہہ کر اس نے ایک آہ سرد بھری اور بیہوش ہو گیا۔

تھوڑی دیر گذری تھی کہ اس کے کانوں میں میٹھی میٹھی باتوں کی آواز آنے لگی۔ اس کی پیاری ماں اس کے پاس آ کر کھڑی ہوئی اس کو گلے لگا کر اس کی بلائیں لیں۔ اس کا باپ اس کو دکھائی دیا۔ چھوٹے چھوٹے بھائی بہن اس کے گرد آ کر کھڑے ہوئے۔ ماں نے کہا کہ "بیٹا کیوں برس بدس کے دن روتا ہے؟ کیوں تو بے قرار ہے؟ کس لئے تیری ہچکی بندھ گئی؟ اُٹھ مُنہ ہاتھ دھو۔ کپڑے پہن۔ نوروز کی خوشی منا۔ تیرے بھائی بہن تیرے منتظر کھڑے ہیں" تب وہ لڑکا جاگا اور سمجھا کہ میں نے خواب دیکھا اور خواب میں بڈھا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا سارا خواب اپنی ماں سے کہا۔ اس نے سن کر اس کو جواب دیا کہ "بیٹا! بس تو ایسا مت کر جیسا کہ اس پشیمان بڈھے نے کیا۔ بلکہ ایسا کر جیسا تیرے دولہن نے تجھ سے کہا"

یہ سُن کر لڑکا پلنگ سے کود پڑا اور نہایت خوشی سے پکارا کہ "اوہ! یہی میری زندگی کا پہلا دن ہے۔ میں کبھی اس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤں گا اور ضرور اُس دولھن کو بیاہوں گا جس نے اپنا خوبصورت چہرا مجھ کو دکھلایا اور ہمیشہ رہنے والی نیکی اپنا نام بتلایا۔ او خُدا! او میری مدد کر"

پس اے میرے نوجوان ہموطنو! اور اے میرے بچو! انسانی بھلائی پر کوشش کرو تاکہ آخیر وقت میں اس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤ ہمارا زمانہ تو آخیر ہے۔ اب خدا سے یہ دعا ہے کہ کوئی نوجوان اُٹھے اور انسانی ہمدردی اور قوم کی بھلائی میں کوشش کرے

خوشامد

دل کی جس قدر بیماریاں ہیں اُن میں سب سے زیادہ مُہلک خوشامد کا اچھا لگنا ہے، جس وقت کہ انسان کے بدن میں ایسا مادہ پیدا ہو جاتا ہے جو وبائی ہوا کے اثر کو جلد قبول کر لیتا ہے، تو اُسی وقت انسان مرض مہلک میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب کہ خوشامد کے اچھا لگنے کی بیماری انسان کو لگ جاتی ہے تو اس کے دل میں ایک ایسا مادہ پیدا ہوتا ہے جو ہمیشہ زہریلی باتوں کے زہر کو چوس لینے کی خواہش رکھتا ہے۔ جس طرح خوش گلو گانے والے کا راگ اور خوش آیند باجے کی آواز انسان کے دِل کو نرم کر دیتی ہے، اسی طرح خوشامد بھی انسان کے دِل کو ایسا پگھلا دیتی ہے کہ ہر ایک کانٹے کے چبھنے کی جگہ اس میں ہو جاتی ہے۔

اوّل اوّل یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی آپ خوشامد کرتے ہیں اور اپنی ہر ایک چیز کو اچھا سمجھتے ہیں اور آپ ہی آپ خوشامد کر کر اپنے دل کو خوش کرتے ہیں، پھر رفتہ رفتہ اوروں کی خوشامد ہم میں اثر کرنے لگتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اول تو خود ہم کو اپنی محبت پیدا ہوتی ہے پھر یہی محبت ہم سے باغی ہو جاتی ہے اور ہمارے بیرونی دشمنوں سے جا ملتی ہے اور جو محبت و مہربانی ہم خود اپنے ساتھ کرتے تھے وہ ہم

خوشامدیوں کے ساتھ کرتے لگتے ہیں اور وہی ہماری محبت ہم کو بتلاتی ہے کہ ان خوشامدیوں پر مہربانی کرنا نہایت حق اور انصاف ہے، جو ہماری باتوں کو ایسا سمجھتے ہیں اور ان کی ایسی قدر کرتے ہیں جب کہ ہمارا دل ایسا نرم ہو جاتا ہے اور اس قسم کے بہسلاوے اور فریب میں آجاتا ہے۔ تو ہماری عقل خوشامدیوں کے مکروفریب سے اندھی ہو جاتی ہے اور وہ مکروفریب ہماری بیمار طبیعت پر بالکل غالب آجاتا ہے۔

لیکن اگر ہر شخص کو یہ بات معلوم ہو جاوے کہ خوشامد کا شوق کیسے نالائق اور کمینہ سببوں سے پیدا ہوتا ہے تو یقینی خوشامد کی خواہش کرنے والا شخص بھی ویسا ہی نالائق اور کمینہ متصور ہونے لگے گا جبکہ ہم کو ایسے ایسے وصف کا شوق پیدا ہوتا ہے جو ہم میں نہیں ہے۔ یا ہم ایسا بننا چاہتے ہیں جیسے کہ درحقیقت ہم نہیں ہیں تب ہم کو اپنے تئیں خوشامدیوں کے حوالے کرتے ہیں جو اوروں کے اوصاف اور اوروں کی خوبیاں ہم میں لگانے لگتے ہیں۔ گو بسبب اس کمینہ شوق کے اس خوشامد کی باتیں ہم کو اچھی لگتی ہوں مگر درحقیقت وہ ہم کو ایسی ہی بدزیب ہیں جیسے کے دوسروں کے کپڑے جو ہمارے بدن پر کسی طرح ٹھیک نہیں۔ اس بات سے ہم اپنی حقیقت کو چھوڑ کر دوسرے کے اوصاف اپنے میں سمجھنے لگیں، یہ بات نہایت عمدہ ہے کہ ہم خود اپنی حقیقت کو درست کریں اور سچ مچ وہ اوصاف خود اپنے میں پیدا کریں اور بعوض جھوٹی نقل بننے کے خود ایک اچھی اصل ہو جائیں، کیونکہ ہر قسم کی طبیعتیں جو انسان

رکھتے ہیں اپنے اپنے موقع پر مفید ہو سکتی ہیں، ایک تیز مزاج اور چست و چالاک آدمی اپنے موقع پر ایسا ہی مفید ہوتا ہے جیسے کہ ایک رونی صورت کا چپ چاپ آدمی اپنے موقع پر۔

خودی انسان کو برباد کرنے والی چیز ہے جب چپ چاپ سوئی ہوئی ہوتی ہے، تو خوشامد اس کو جگاتی ہے اور ابھارتی ہے اور جس کی خوشامد کی جاتی ہے اس میں چھچھورے پن کی کافی لیاقت پیدا کر دیتی ہے مگر یہ بات بخوبی یاد رکھنی چاہیئے کہ جس طرح خوشامد ایک بد تر چیز ہے اسی طرح مناسب اور سچی تعریف کرنا نہایت ہی عمدہ اور بہت ہی خوب چیز ہے جس طرح لائق شاعر دوسروں کی تعریف کرتے ہیں کہ ان اشعار سے ان لوگوں کا نام باقی رہتا ہے جن کی تعریف کرتے ہیں، اور شاعر کی خوبی سے خود ان شاعروں کا نام بھی دنیا میں باقی رہتا ہے، دونوں شخص خوش ہوتے ہیں، ایک اپنی لیاقت کے سبب سے اور دوسرا اس لیاقت کو تمیز کرنے کے سبب سے، مگر لیاقت شاعری کی یہ ہے کہ وہ نہایت بڑے استاد مصور کی مانند ہو، کہ وہ اصل صورت اور رنگ و خال و خط کو بھی قائم رکھتا ہے اور پھر بھی تصویر ایسی بناتا ہے کہ خوشنما معلوم ہو۔

ایشیا کے شاعروں میں ایک بڑا نقص یہی ہے کہ وہ اس بات کا خیال نہیں رکھتے۔ جس کی تعریف کرتے ہیں اس کے اوصاف ایسے جھوٹے اور ناممکن بیان کرتے ہیں جن کے سبب سے وہ تعریف نہیں رہتی بلکہ فرضی خیالات ہو جاتے ہیں۔

ناموری کی مثال نہایت عمدہ خوشبو کی ہے۔ جب ہوشیاری اور سچائی سے ہماری واجب تعریف ہوتی ہے تو اس کا ویسا ہی اثر ہوتا ہے جیسے عمدہ خوشبو کا، مگر جب کسی کمزور دماغ میں زبردستی سے وہ خوشبو ٹھونس دی جاتی ہے تو ہر ایک تیز بو کی مانند دماغ کو پریشان کر دیتی ہے۔ فیاض آدمی کو بدنامی اور نیکنامی کا زیادہ خیال ہوتا ہے اور عالی ہمت طبیعت کو مناسب عزت اور تعریف سے ایسی ہی تقویت ہوتی ہے جیسے کہ غفلت اور حقارت سے پست ہمتی ہوتی ہے جو لوگ کہ عوام کے درجے سے اوپر ہیں انھیں لوگوں پر اس کا زیادہ اثر ہوتا ہے جیسے کہ تھرمامیٹر میں وہی حصہ موسم کا زیادہ اثر قبول کرتا ہے جو صاف اور سب سے اوپر ہوتا ہے۔

نوروز

سوا چار برس بخیریت گذر گئے - اب پھر نیا سال شروع ہوا۔ گذشتہ برسوں میں جو کچھ ہنگامے ہونے تھے ہو لئے - اب دُم باقی رہ گئی ہے جیسا کہ بڑھیا کی کہانی ہے کہ ہاتھی نکل گیا پر دُم باقی ہے - آج اگر ہم اپنی قسمت پر فخر کریں تو بھی بجا ہے اور اگر اپنی قوم کے اقبال کی فصل کی آمد آمد کی خوشیاں منائیں تو بھی زیبا ہے - جو کچھ کہ اس سوا چار برس میں ہوا - کیا ایسے قلیل زمانہ میں اس کے ہونے کی ہم کو توقع تھی - توبہ توبہ! کیا ہم کو ایسا جلد ان ناچیز پرچوں سے اپنی قوم کے جگانے اور اٹھانے کی جو مدت دراز سے غفلت کے تاریک گڑھے میں پڑی ہوئی بے خبر سو رہی تھی توقع تھی - استغفراللہ!

وہ عید کا مبارک دن - یعنی یکم شوال سنہ ۱۲۸۰ نبوی اور سنہ ۱۲۸۷ ہجری جب کہ ہمارا پہلا پرچہ نکلا - امید ہے کہ ہماری قوم کی تاریخ میں کبھی بھولا نہ جاوے گا - ہماری قوم کی جو کچھ بد اقبالی تھی وہ یہی تھی کہ کچھ نہ تھے اور جانتے تھے کہ ہم سب کچھ ہیں - اس غفلت کی دار وئے بے ہوشی نے ان کے کانوں کو بہرا کر دیا تھا - ان کی آنکھوں کو پتھرا دیا تھا - دل پتھر ہو گئے تھے - دماغ قابو میں نہیں رہا تھا - ہاتھ پاؤں شکستہ ہو گئے تھے - زندہ تھے پر مردوں سے بدتر تھے - اٹھتے - بیٹھتے - چلتے - پھرتے تھے - پر کچھ نہ کرتے تھے اسی تھوڑے عرصہ میں وہ حالت بہت کچھ بدل گئی - کچھ لوگ بخوبی ہوشیار ہو گئے وہ سمجھے کہ ہماری کیا حالت ہے اور ہم پر کیا مصیبت ہے - لبوں پر جان ہے مگر

اگر جان نہیں تو جہان نہیں۔ کچھ لوگ ہوشیار ہوئے پر ابھی آنکھیں ملتے ہیں۔
بہت سونے اور اندھیرے میں پڑے رہنے سے آنکھوں میں چیپڑ جما ہوا
ہے۔ کچھ کھلتی ہیں مگر روشنی سے چوندھیا جاتی ہیں۔ کچھ لوگ ابھی تک نیند کے
خمار میں ہیں کچھ حرکت تو ان میں آئی ہے مگر ابھی انگڑائی لے کر اور کروٹ
بدل کر پھر غافل ہو جاتے ہیں۔ جب پھر جھنجھوڑو تو ہاں۔ اچھا کہکر دوسری
کروٹ لیتے ہیں اور پھر غافل ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ ابھی بدستور
غافل پڑے سوتے ہیں۔ اور کچھ ایسے ہیں کہ ہوشیار ہوئے ہیں مگر بدمزاجی اور
تندخوئی سے ضد میں آکر کمل تانے پڑے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہاں ہم نہیں
اٹھنے کے۔ تمہارا کیا چارا ہے۔ ہم یوں ہی پڑے رہیں گے۔ بعضے اُن میں
سے اپنے پاس والوں کو کہتے ہیں کہ تم بھی پڑے رہو مت اٹھو۔ سید احمد کون
ہے جو جگاتا پھرتا ہے؟ ہم اسی بات کو سن کر خوش ہوتے ہیں۔ اور دور ہی سے
کھڑے کہتے ہیں کہ وہ اٹھے۔ وہ کلبلائے۔ خدا نے چاہا تو اب سمجھ دار بھی ہو جاویں گے۔
یہی درست و خیر ہماری قوم کے اقبال کی نشانی ہے۔ پتھر پسیجا تو سہی۔ اب کسی نہ
کسی طرف بہ نکلے گا۔ لوہا پگلا تو سہی۔ اب کچھ نہ کچھ ڈھل رہے گا۔ بند پانی سے بجز
سڑ جانے کے اور کچھ نہیں ہونا۔ پانی کو بہنا چاہیئے۔ پھر کوئی نہ کوئی اپنا رستہ بنا لے گا
اس وقت ہماری ساری قوم میں اس بات کا غلغلہ ہے کہ ہماری حالت اچھی
نہیں۔ قوم کے لئے کچھ کرنا چاہیئے۔ کیا یہ صدا ان لوگوں کے دلوں میں جو قومی بھلائی
چاہنے والے ہیں جان نہیں ڈال دیتی ہے؟ سولزیشن جس کے نام سے لوگوں
کو نفرت تھی کیا اب اس کا چرچا ہر گلی کوچہ میں نہیں ہے۔ کیا نیچر کا قافیہ پھیر کہتے

ہوئے اب لوگوں کو شرم نہیں آتی ہے (معاف کیجئے ان ضدی سونے والوں کا ذکر نہیں ہے) کیا قومی ہمدردی کی کسی نہ کسی قدر تحریک اب ہر ایک کے دل میں نہیں ہے۔ کیا چار دانگ ہندوستان کے اخباروں میں تہذیب، تہذیب، سولزیشن، سولزیشن۔ قومی ہمدردی قومی ہمدردی۔ پیٹریا ٹزم، پیٹریا ٹزم۔ کا غلغلہ نہیں ہے۔ کوئی اخبار اٹھاؤ اس میں۔ ان میں سے کسی نہ کسی پر کوئی نہ کوئی چھوٹا موٹا آرٹیکل دیکھ لو۔ جس گلی کوچہ میں جاؤ سید احمد کے تہذیب الاخلاق کا جھگڑا سن لو۔ مکہ میں جاؤ تو سید احمد کو پاؤ۔ مدینہ میں جاؤ تو سید احمد کو پاؤ۔ برا کہو خواہ بھلا کہو۔ مگر ہم دعا گوؤں کو مت بھولو ؎

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے   کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

یہ ولولہ اور غلغلہ اور ہر ایک بات کا چرچا در اصل ہماری قوم کی بھلائی کی نشانی ہے۔ اس پر ہم کو ذرا بھی خیال نہیں ہے کہ کسی کی کیا رائے ہے اور کسی کی کیا۔ کیوں کہ جو بات ٹھیک نہیں ہے وہ آج نہیں کل، کل نہیں پرسوں سب کو معلوم ہو جاوے گی اور سب اسی پر یقین کریں گے اور اسی پر متفق ہوں گے۔ ضرور ایک دن آوے گا جو قوم کہے گی کہ ہاں سید احمد بھی کوئی دیوانہ تھا۔ پر بات ٹھکانے کی کہتا تھا۔ اگر ہمارا یہ خیال صحیح ہو اور در حقیقت ہماری قوم میں ایسی تحریک آ گئی ہو، تو ہمارے اس ناچیز پرچہ نے اپنا کام پورا کر لیا اور اس کی مراد پوری ہو گئی۔

مگر ہمارے بعض محب وطن جو دل سے اپنی قوم کی بھلائی اور قومی ترقی چاہتے ہیں، کبھی غلطی میں پڑ جاتے ہیں۔ جب کبھی ان کو کسی سولائزڈ یعنی مہذب و تربیت یافتہ شائستہ قوم میں سے کسی کی کوئی وحشیانہ حرکت معلوم ہوتی ہے تو اس کو بہت طمطراق سے بیان کرتے اور لکھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ جب اس قوم میں بھی ایسی وحشیانہ حرکتیں ہوتی ہیں تو ہماری قوم کو کیوں بُرا کہا جاتا ہے۔ مگر ان کو سمجھنا چاہیے کہ اگر ہم کسی دوسرے کی آنکھ کی پھلی کو ٹوکیں تو اس سے ہماری آنکھ کا ٹینٹ نہیں چھپتا۔ ہم کو اپنی آنکھ کے ٹینٹ کا علاج کرنا چاہیئے دوسرے کی آنکھ میں پھلی ہو یا نہ ہو۔ بایں ہمہ وہ لوگ اس بات میں ذرا انصاف کی بھی نظر نہیں کرتے۔ قوم کی محبت انصاف کو چھپا دیتی ہے۔ جس قوم کے کسی شخص کی وحشیانہ حرکت کی ہم گرفت کرتے ہیں۔ اس وقت اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ اس قوم میں خوبیاں کتنی ہیں ہماری قوم میں وہ عیب تو ہیں اور وہ خوبیاں کسی میں نہیں۔ اصلی محبت اور سچی خیر خواہی قوم کی یہی ہے کہ اس کے نقصانوں کو دیکھے اور ان کے مٹانے کی فکر کرے۔ جو لوگ نہایت ہمدردی اور قومی محبت سے اپنی قوم کے عیبوں اور نقصانوں سے مطلع کرتے ہیں۔ ان کا دل اپنی قوم کی حالت پر بہ نسبت ان کے جو قوم کی طرف داری کرتے ہیں اور اس کے عیبوں کو چھپاتے ہیں بہت زیادہ جلتا ہے اور حقیقت میں وہی لوگ محب وطن و محب قوم ہیں۔

ترقی علم انشا

جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اردو زبان کے علم و ادب کی ترقی میں اپنے ناچیز پرچوں کے ذریعہ سے کوشش کی مضمون کے ادا کا ایک سیدھا طریقہ اختیار کیا۔ جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری دی الفاظ کی درستی بول چال کی صفائی پر کوشش کی۔ رنگینیٔ عبارت سے جو تشبیہات اور استعارات خیالی سے بھری ہوتی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا پرہیز کیا۔ تک بندی سے جو اس زمانہ میں مقفٰے عبارت کہلاتی تھی ہاتھ اٹھایا۔ جہاں تک ہو سکا، سادگی عبارت پر توجہ کی۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ صرف مضمون کے ادا میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ہماری یہ کوشش کہاں تک کارگر ہوئی اور ہمارے ہم وطنوں نے اس کو کس قدر پسند کیا۔ مگر اتنی بات ضرور دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے خیالات میں ضرور تبدیلی آگئی ہے اور اس کی طرف لوگ توجہ متوجہ بھی معلوم ہوتے ہیں۔ اخباروں کی عبارتیں نہایت عمدہ اور صاف ہوتی جاتی ہیں۔ وہ پہلا ناپسند طریقہ ادائے مضمون کا بالکل چھوٹتا جاتا ہے۔ بھاری بھاری لفظوں اور موٹے موٹے لغتوں سے اردو زبان کا خون نہیں کیا جاتا۔ صفائی اور سادگی روز بروز عبارتوں میں بڑھتی جاتی ہے۔ خیالات بھی بالکل بدلے ہوئے ہیں۔ بہت کم اخبار ایسے ہوں گے جن میں ہر ہفتے کوئی نہ

کوئی آرٹیکل عمدہ وسلیس عبارت میں کسی نہ کسی مضمون پر نہ لکھا جاتا ہو۔ صرف اس بات کی کمی ہے کہ وہ سامان ہمارے پاس موجود نہیں ہے جس سے ہمارے معلومات زیادہ ہوں اور ہمارے خیالات کو وسعت ہو۔ جو مضمون ہم لکھنا چاہیں ان کے ماخذ اور ان کے حالات اور جو بحثیں کہ ان پر ہو چکی ہیں اور جو امور ان کی نسبت متحقق ہو چکے ہیں ان سے آگاہی ہو اور یہی سبب ہے کہ بعضی دفعہ ہماری قوم کے آرٹیکلوں میں غلطی ہو جاتی ہے اور جن امور کا تصفیہ ہو چکا ہے ان ہی کو پھر کہے جاتے ہیں۔ یہ نقص اسی وقت رفع ہوگا جب کہ انواع واقسام علوم وفنون کی کتابیں ہماری زبان میں موجود ہو جاویں گی اور ہماری قوم کو عموماً ان پر دسترس ہو گی۔ سین ٹیفک سوسائٹی علی گڈھ نے اس کام کے پورا کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ قوم کو اس طرف توجہ نہیں ہے اور اسی سبب سے اس کا کام ادھورا پڑا ہے۔

نئی اردو نے درحقیقت ہماری ملکی زبان میں جان ڈال دی ہے۔ میر ودرد وظفر نے اردو اشعار میں جو کچھ سحر بیانی کی ہو، میر موتمن دہلوی نے کوئی کہانی شستہ بول چال میں کہہ دی ہو کہہ دی ہو۔ جو اس سے زیادہ فصیح ودلچسپ بامحاورہ نہ ہو گی جو ایک پوپلی بڑھیا بچوں کے سلاتے وقت ان کو کہانی سناتی ہے۔ مضمون نگاری دوسری چیز ہے جو آج تک اردو زبان میں نہ تھی۔ یہ اسی زمانہ میں پیدا ہوئی اور ابھی نہایت بچپن کی حالت میں ہے۔ اگر ہماری قوم اس پر متوجہ رہے گی اور ایشیائی خیالات کو نہ ملائے گی جو اب حد سے زیادہ اجیرن ہو گئے ہیں تو چند روز میں ہماری ملکی تحریریں

بھی میکالے واڈلیسن کی سی ہو جاویں گی۔

بعض لوگوں کو شکایت ہے کہ جو لوگ اس زمانہ میں اردو لکھتے ہیں وہ انگریزی لفظ اپنی تحریروں میں ملاتے ہیں مگر ان کو غور کرنا چاہیئے کہ زندہ زبان میں ہمیشہ نئے نئے لفظ ملتے اور بنتے ہیں اور جب کوئی زبان محدود ہو جاتی ہے مردہ کہلاتی ہے غیر زبان کے الفاظ کو اپنا کر لینا اہل زبان کا کام ہے مگر ان کا ملا لینا آسان کام نہیں۔ اہل زبان غیر زبان کے لفظ کو ایسی عمدگی سے ملا لیتے ہیں جیسے تاج گنج کے روضہ میں سنگ مرمر پر عقیق دیا قوت وزمرد کی پچکاری ہے۔ بے شک وہ دوسرا پتھر ہے مگر ایسا وصل ہوا ہے کہ غور سے دیکھنے پر بھی اوپر سے جڑا ہوا نہیں معلوم ہوتا اسی میں سے پیدا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات اہل زبان کے سوا دوسرے سے نہیں ہو سکتی اور نہ سب اہل زبان سے، بلکہ صرف اس سے جسے خدا نے ایسا ملکہ دیا ہو۔

یہ بات بھی غور کرنی چاہیئے کہ اہل زبان کے لفظوں کے لینے کی کیوں ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے متعدد اسباب ہوتے ہیں۔ ایک مورخ جو کسی ملک کی تاریخ لکھتا ہے اس کو ضرور ہوتا ہے کہ اس ملک کے تاریخی الفاظ یعنی جو تاریخ سے متعلق ہیں اور ملکوں کی تقسیم اور مناسب اسی ملک کی زبان میں قائم رکھے کیونکہ اگر ان کے لئے اپنی زبان کے الفاظ اور اصطلاح بدل دے تو وہ تاریخ نہایت نکمی اور غیر مفید ہو جاوے گی۔ ٹونس میں جو تاریخیں غیر ملکوں کی عربی زبان میں ترجمہ ہو کر تصنیف ہوئی ہیں۔ ان کو دیکھو کہ کس

قدر غیر زبان کے الفاظ معرب وغیر معرب ان میں شامل ہیں۔ عربی اخبار الجوائب کو دیکھو اس کا کیا حال ہے۔ قرآن مجید کو پڑھو اور دیکھو اس میں کس قدر الفاظ دوسری زبانوں کے داخل ہیں۔ اگر عربی زبان کے علم وادب اور علوم وفنون میں الفاظ جدیدہ شامل ہونے بند ہو جاتے تو وہ زبان بھی مثل عبرانی وسنسکرت وژند کے مردہ زبان ہو جاتی۔

علوم وفنون پر کتابیں لکھنے والا بعض دفعہ مجبور ہوتا ہے کہ جس زبان سے اس علم کو لیا ہے اسی زبان کے بعض الفاظ اور مصطلحات بدستور قائم رکھے۔ دیکھو یونانی زبان سے جو علم طب عربی میں ترجمہ ہوا کس قدر یونانی الفاظ اس میں شامل ہیں۔ اگر کسی کو کیمسٹری نہ ہو تو ضرور اس کو تسلیم کریگا۔ عربی زبان سے کمسٹری انگریزی میں گئی۔ آج تک بہت سے عربی لفظ انگریزی زبان کی کمسٹری میں شامل ہیں۔

پوچھو کہ اس مقام پر میں نے کیوں لفظ کمسٹری بولا اور کیمیا کا لفظ جس سے خود انگریزوں نے لفظ کمسٹری بنایا ہے کیوں نہ بولا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم لوگوں میں کیمیا کے لفظ کے ساتھ چاندی سونا بنانے کا خیال پیدا ہوتا ہے جو ایک محض غلط خیال ہے۔ اب وہ شخص جو اپنی قوم کی ہمدردی رکھتا ہے اور ان غلط خیالات کو مٹانا چاہتا ہے کسی جگہ کمسٹری اور کسی جگہ کیمیا کا لفظ بول جاتا ہے تاکہ کمسٹری کا لفظ اس غلط خیال کو نہ آنے دے اور کیمیا کا لفظ کمسٹری اور کیمیا کے ایک ہونے کا خیال نہ پیدا کرے۔

لٹریچر یعنی علم ادب اہل زبان کے لئے نہایت وسیع جولان گاہ ہے۔

اس میں وہ اپنی طبیعت کا زور دکھلاتا ہے۔ اسی کے ذریعہ سے وہ اپنے دل کی بات دوسرے کے دل میں ڈالتا ہے۔ اپنی شستہ تقریر اور مناسب الفاظ سے لوگوں کے دلوں کو جس بات پر چاہتا ہے ابھارتا ہے ان ہی لفظوں سے کبھی ہنسا دیتا ہے اور کبھی رولا دیتا ہے۔ پرانے دقیانوسی خیالوں کو مٹاتا ہے اور نئے نئے خیالات دلوں میں ڈالتا ہے۔ کبھی واحد کے بدلے جمع اور جمع کے بدلے واحد کے صیغے بولتا ہے۔ کبھی حاضر کو غائب اور غائب کو حاضر کہہ دیتا ہے۔ کبھی ترکیب جملہ کی دوسری زبان کی ترکیب پر گھڑ دیتا ہے۔ اور اس سب میں ایک لطف اور ایک قسم کا مزہ رکھتا جاتا ہے۔ اگر وہی چال وہ چلے جو اہل زبان نہیں ہے تو سینکڑوں ٹھوکریں کھاتا ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ اہل زبان جو کہے سو صحیح ہے اور غیر اہل زبان وہ چال چلے تو غلط ہے۔ نہیں درحقیقت اس کا کہنا صحیح اور اس کا بولنا غلط ہوتا ہے اور اہل زبان ہی اس میں تمیز کر سکتا ہے۔

دوسری زبان کے لفظوں کو اپنی زبان میں بولنا کبھی عبارت کا لطف بڑھانے کے لئے ہوتا ہے کبھی اپنی زبان کو وسعت دینا اور نئے لفظوں کو اس میں داخل کرنا مقصود ہوتا ہے کبھی سامعین کو مطلب کی طرف زیادہ متوجہ کرنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ کبھی اس مطلب کی عظمت جتانے کو کہا جاتا ہے جو عظمت اس مرادف لفظ سے جو اس زبان میں مستعمل ہے دل میں نہیں بیٹھتی۔ مثلاً بعضے اہل زبان تحریر و تقریر میں مناسب موقع پر جس کی مناسبت کو اہل زبان ہی جان سکتے ہیں جنٹلمین کا لفظ بولتے ہیں۔

اگر وہ اس کی جگہ شریف یا شریفوں کا لفظ بولیں تو اس لفظ یا مطلب کی عظمت خاک میں مل جاتی ہے۔ اس لیئے کہ ہماری زبان اور عام استعمال میں لفظ شریف کا ذلیل ہوگیا ہے۔ اس سے بجز اس خیال کے کہ اس کی حسب ونسب میں کچھ نقصان نہیں ہے۔ شیخ۔ سید مغل۔ پٹھان ہے اور کوئی خیال پیدا نہیں ہوتا مگر اس لفظ کے بولنے والا اس خیال سے زیادہ تر وسیع اور اعلیٰ خیال دل میں بٹھانا چاہتا ہے۔ وہ اس لفظ سے ایسا شخص بتانا چاہتا ہے جو رذیل آدمیوں کی بہ نسبت خاندان میں، تعلیم میں، حیثیت میں، اطوار میں افضل ہو۔ اس کی تعلیم و تربیت اس کا چال چلن اچھا ہو۔ نیک اور خوش اخلاق ہو۔ وہ ہر بات میں جو اس سے متعلق ہو حلیم ہو۔ چال چلن میں حوصلہ و مزاج میں، خواہش اور ارادہ میں سلیم ہو۔ ایسا ہونا تعلیم سے شروع ہوتا ہے۔ اور بڑھے کو گنا اور نیک صحبت میں بیٹھنا اس کو پورا کرتا ہے۔ اگرچہ شریف کے بھی یہی معنی ہونے چاہئیں مگر چونکہ اس کا استعمال ایک خاص بات پر ہوگیا ہے تو یہ پورا پورا خیال اس لفظ سے دل میں نہیں آتا پس ایک مہذب قوم اہل زبان ان خیالوں کو دل میں ڈالنے کے لیئے اپنی زبان کو وسعت دیتا ہے۔ اور دوسری زبان کا نیا لفظ اپنی زبان میں ملاتا ہے تاکہ نئے لفظ کے ساتھ نیا خیال دل میں پیدا ہو۔ یہی حال اس قسم کے اور لفظوں کا ہے۔ اگر ہم ان سب کی تفصیل لکھیں تو ہمارا یہ آرٹیکل لغت یا اصطلاحات کی ایک کتاب ہوجاوے۔ اسی نمونہ سے ہمارے ہم وطن خیال کرسکیں گے

کہ ہماری قوم کو اپنی زبان کی نسبت بھی کیا کیا کرنا ہے۔ اور ان لغو خیالات کو چھوڑیں گے کہ وہ شخص تو انگریزیت پر مرتا ہے۔ انگریزی ہی لفظ بولتا ہے اپنی واقف کاری انگریزوں کی جتاتا ہے۔ کیوں کہ کسی جنٹلمین کو ایسے ذلیل خیالات کسی جنٹلمین کی نسبت کرنے زیبا نہیں۔

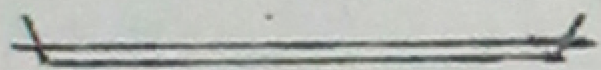
اردو نظم

ہم نے جو نیچر کی بہت ہائے پکار کی تو اب اس کا قافیہ کیچڑ تو نہیں رہا۔ بلکہ شاعروں نے اس کی طرف توجہ کی۔ ہماری زبان کے علم و ادب میں بہت بڑا نقصان یہ تھا کہ نظم پوری نہ تھی۔ شاعروں نے اپنی ہمت عاشقانہ غزلوں اور واسوختوں اور مدحیہ قصیدوں اور ہجر کے قطعوں اور قصہ و کہانی کی مثنویوں میں صرف کی تھی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان مضامین کو چھونا نہیں چاہیئے تھا۔ نہیں وہ بھی نہایت عمدہ مضامین ہیں اور جودت طبع اور تلاش مضمون کے لئے نہایت مفید ہیں۔ مگر نقصان یہ تھا کہ ہماری زبان میں صرف یہی تھا۔ دوسرے دوسری قسم کے مضامین، جو در حقیقت وہی اصلی مضامین ہیں اور نیچر سے علاقہ رکھتے ہیں نہ تھے۔ نظم کے اوزان بھی وہی معمولی تھے۔ ردیف و قافیہ کی پابندی گویا ذات شعر میں داخل تھی۔ رجز اور بے قافیہ شعر گوئی کا رواج ہی نہیں تھا اور اب بھی شروع نہیں ہوا۔ ان باتوں کے نہ ہونے سے حقیقت میں ہماری نظم صرف ناقص ہی نہ تھی بلکہ غیر مفید بھی تھی۔ مگر نہایت خوشی کا مقام ہے کہ زمانہ نے اس کو بھی رفارم کیا

اور اہل پنجاب اس نقص کے رفع کرنے پر متوجہ ہوئے۔ اردو زبان کے علم ادب کی تاریخ ۱۸۷۴ء کا وہ دن جب لاہور میں نیچرل پوئٹری کا مشاعرہ قائم ہوا ہمیشہ یاد رہے گا۔

ہز آنر لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب اور مسٹر ہالرائیڈ ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن پنجاب نے اس مشاعرہ کے قائم ہونے پر بڑی توجہ کی ہے، جس کی شکر گزاری ہماری قوم پر واجب ہے۔ ہماری قوم کے لائق و فائق لوگوں نے بھی اس پر بخوبی توجہ کی ہے۔ مولوی محمد حسین صاحب آزاد پروفیسر عربی گورنمنٹ کالج لاہور نے اس مشاعرہ کے بقا اور قیام میں سب سے زیادہ ہمت مصروف کی ہے ان کی طبیعت کے زور اور پاکیزگی مضامین اور شوکت الفاظ اور طرز ادا سے ہم لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کی مثنوی خواب امن جو آفتاب پنجاب میں چھپی ہمارے دلوں کو خواب غفلت سے جگاتی ہے مولوی خواجہ الطاف حسین حالی اسسٹنٹ ٹرانسلیٹر محکمہ ڈائرکٹر پنجاب کی مثنویوں نے تو ہمارے دلوں کے حال کو بدل دیا ہے انکی مثنوی حب الوطن اور مثنوی مناظرہ رحم و انصاف جو پنجابی اخبار میں چھپی ہیں درحقیقت ہمارے زمانہ کے علم ادب میں ایک کارنامہ ہیں۔ ان کی سادگی، الفاظ صفائی بیان، عمدگی خیال ہمارے دلوں کو بے اختیار کھینچتی ہے۔ وہ مثنویاں آب زلال سے زیادہ خوش گوار ہیں۔ بیان میں، زبان میں، آمد میں الفاظ کی ترکیب میں، سادگی و صفائی میں کیسی عمدہ ہیں کہ دل میں بیٹھی جاتی ہیں۔ ہاں یہ بات سچ ہے کہ ہمارے ان باعث افتخار شاعروں کو ابھی نیچر کے میدان میں پہنچنے کے لیے آگے قدم اٹھانا ہے اور اپنے اشعار کو نیچرل پوئٹری کے ہم سر کرنے میں بہت کچھ کرنا ہے۔

مگر ان مثنویوں کے دیکھنے سے اتنا خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ خیالات میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے۔ اور اس کا بھی تصور ہو سکتا ہے کہ ہماری قوم اس عمدہ مضمون نیچر کی طرف متوجہ رہے اور ملٹن اور شکسپیر کے خیالات کی طرف توجہ فرمائے اور مضامین عشقیہ اور مضامین خیالیہ اور مضامین بیان واقع اور مضامین نیچر میں جو تفرقہ ہے اس کو دل میں بٹھالے تو ان بزرگوں کے سبب ہماری قوم کی لٹریچر کیسی عمدہ ہو جاوے گی اور ضرور وہ دن آوے گا کہ ہم بھی اپنی قوم کے کسی نہ کسی فرد پر ایسا ہی فخر کریں گے جیسے کہ یورپ کے لوگ ملٹن اور شکسپیر پر ناز کرتے ہیں۔ مضامین بیان واقع اور مضامین نیچر ایسے پاس پاس ہیں کہ ان میں دھوکہ پڑ جاتا ہے۔ مگر درحقیقت پہلا دوسرے سے بالکل علیحدہ ہے۔ پہلا تو ایک بیرونی حالت ہے اور دوسرا اندرونی۔ اسی پچھلے میں وہ طاقت ہے جو دل میں اثر کرتی ہے۔ ابھی تک ہماری قوم کا کلام بیرونی حالت سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ مگر ہم کو امید ہے کہ بہت جلد وہ اندرونی حالت تک بھی پہنچ جاوے گا۔



علوم کی بدنصیبی

تمہید

تمام صاحب جوہر اور کل اہل کمال ہمیشہ سے ان نالائقوں اور غلط نما باکمالوں کے ہاتھ سے نالاں ہیں، جو فلک کے سفلہ پروری یا قسمت کی یاوری سے ہوائے مراد کے بیلون میں بیٹھے ہیں اور ترقیوں کے آسمان پر سیر کرتے پھرتے ہیں۔ اس معاملہ میں اہل علوم سے زیادہ کوئی واجب الرحم نہیں۔ صدیوں کے بعد تو کوئی صاحب صنعت پیدا ہوتا ہے پھر اگرچہ ہر شخص کے کام کی ترقی خاص و عام کی قدر دانی پر منحصر ہے۔ لیکن بنیاد اس کی حکام یا اہل دول کی بدولت قائم ہوتی ہے اسی واسطے اس کی رونق بازار کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے اور ان خرابیوں کا بیان کرنا حد قلم سے باہر ہے اول تو اہل کمال ہمیشہ کم اور بے کمال انبوہ در انبوہ ہیں۔ ان کی بھیڑ بھاڑ ایسی خاک اڑاتی ہے کہ ان کے کمال پر خاک پڑ جاتی ہے۔ ناچار دل شکستہ ہو کر بیٹھ رہتے ہیں۔ جو ثابت قدم رہتے ہیں ان کی بدنصیبی یہ کہ جن قدر دانوں پر مدار کار ہے کبھی کثرت کار سے، کبھی بے پروائی سے، غرض تھوڑے ہی دنوں میں وہ اپنے شوق کو ان لوگوں کے حوالے کر دیتے ہیں جو اس کام کے لائق نہیں

اس صورت میں اگر قسمت سے ہوا چلی اور خود بخود کسی کی گود میں ثمر مراد آپڑا تو آپڑا۔ نہیں تو ذلت، تباہی اور دربدری کے سوا کچھ حاصل نہیں۔ ان ناگوار باتوں کو غلط نما با کمال گوارا کر لیتے ہیں۔ مگر اصل با کمال مرنے کو اس سے بہتر سمجھتے ہیں۔ پھر بھی ناچار گوارا کرنی پڑتی ہیں۔ سفارشیں اٹھاتے ہیں۔ در بدر پھرتے ہیں خوشامدیں کرتے ہیں۔ غرض کہ اس رستے کی منزلوں میں جو جو مصیبتیں پیش آتی ہیں وہ ایک افسانہ کے استعارہ میں بیان ہوتی ہیں۔

آغاز مطلب

علوم و فنون نے دیکھا کہ مدت گذر گئی ہمارے مرید اور خدمت گزار فقط اپنی ارادت دلی سے انسان کے فائدوں کے لئے محنت کر رہے ہیں اور جس صدق دل سے جاں فشانی اور عرق ریزی کرتے ہیں اس کا صلہ کچھ بھی نہیں ملتا۔ بلکہ جن بے لیاقتوں کو جوہر کمال سے کچھ واسطہ نہیں اور انسان کی نفع رسانی کی بھی کچھ پرواہ نہیں رکھتے وہ کامیابی اور عیش و عشرت کی بہاریں لوٹ رہے ہیں۔ سب کو اس بات کا بہت رنج ہوا اور سلطان آسمانی کے دربار میں عرضی کی۔ خلاصہ جس کا یہ کہ انصاف و عدالت کے بموجب تمام مریدان خدمت گزار کو بمقتضائے انصاف و عزت اور دولت کے انعام مرحمت ہونے واجب ہیں۔ دربار میں مشتری صدر اعلیٰ تھا اور عطارد میر منشی۔ جب یہ عرضی پڑھی گئی تو جو جو خدمتیں اور ادائے خدمت میں مشقتیں تھیں سب جتائی اور دکھائی گئیں، اور حق تلفیوں کا دعویٰ کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ فی الحقیقت

عالم خاک میں علوم و فنون کی کوششوں اور کار گذاریوں کا شکریہ کسی نے ادا نہیں
گیا۔ اب وہ آئے دن کے دکھ بھرتے بھرتے ایسے دق ہو گئے ہیں کہ یقین ہے
چند روز میں دنیا کو چھوڑ کر عالم بالا کی طرف چلے آئیں۔ اور اگر وہ دنیا میں نہ رہے
تو حضرت انسان جنہوں نے یہ شوکت و شان بنائی ہے، حیوانوں سے بدتر رہ
جائیں گے۔ پھل پھلاری گھاس پات چرتے پھریں گے۔ جنگلوں کے جانور بن
جائیں گے، اور حیوان سے زیادہ وحشی ہوں گے وہ انھیں پھاڑ کھائیں گے،
اس کے فیصلے کے لئے عالم بالا میں کمیٹی ہوئی۔ قاعدہ ہے کہ جو اراکین دربار کا
رنگ ہوتا ہے وہی کل دربار کا رنگ ہوتا ہے، چنانچہ سب کا اتفاق رائے
اس بات پر ہوا کہ ضرور کسی کو بھیجنا چاہیئے۔ ملکہ کوکب جمال کی ایک بیٹی
تھی کہ باپ اس کا عالم خاکی سے تھا۔ مگر اس کے نور جمال اور حسن کمال نے
تمام عالم کو روشن کر رکھا تھا اور صداقت و حقیقت کے مدرسے میں تعلیم پائی
تھی۔ اسے حضور سے ملکہ علم افروز کا خطاب عطا ہوا۔ اور عقل کا تاج سر پر
رکھا گیا۔ جس میں آفتاب کی طرح فہم و ادراک کی شعاعیں جگمگاتی تھیں۔
رفعت کا تخت پھولوں سے سجایا۔ اس پر ملکہ موصوفہ کو جلوہ گر کر کے اس طرف
روانہ کیا۔ آسمان نے تارے اور زمین نے بجائے غبار کے نور اڑایا۔ اس نے
بھی عالم میں آکر باپ کی طرف سے وہ شوکت و شان لیاقت دکھائی، جس
سے تمام بے لیاقت ٹھہرا گئے اور ماں کی طرف سے وہ روشنی پھیلائی کہ خاک کا
کرہ نور کی قندیل ہو گیا۔ دن رات دربار جاری تھا۔ علوم کے مسائل اور ان
کی تصنیفات کے مقدمات پیش ہوتے تھے۔ اُستاد یعنی صداقت کی طرف

سے متانت اور خاموشی مصاحبت میں آئی تھیں۔ چنانچہ علوم و فنون جن لوگوں کی سفارش کرتے تھے۔ وہ ان ہی کے ذریعہ آکر پیش ہوتے تھے۔

عالم بالا کے لوگ علم کے عاشق تھے۔ سب اس کی فرماں روائی دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ جلوس دربار کے لئے ہر طرح کے سامان بھیجے۔ اور بارگاہ شاہی نے عجب شان وشکوہ حاصل کی۔ جب دربار میں آکر بیٹھی تو عدل و انصاف کھوٹے کھرے کو پرکھنے کو کھڑے رہتے۔ اُمید سامنے ناچا کرتی قدردانی دست راست پر کھڑی رہتی اور سخاوت کے اشارے کے بموجب ہر ایک کو انعام دیتی کہ قسمت کے ہاتھوں لوگوں تک پہنچ جاتے تھے۔ ایک دن ملکہ عالم افروز اپنے رفعت کے تخت ہوادار پر سوار ہو کر ہوا کھانے نکلی۔ اتفاقاً ایک پہاڑ کی طرف گذر ہوا۔ کوہ مذکور پر جہالت ایسی چھائی ہوئی تھی کہ دامن کوہ سے لے کر چوٹی تک تمام دھواں دھار سے گھٹ رہا تھا۔ اس کے قدم سے سیاہی کے دھوئیں اُڑ گئے اور تمام تاریکی برطرف ہو گئی۔ یہاں اگر چھاؤں تھی تو نہ بارش کی سیرابی سے بلکہ گھٹاؤ کے پسینے سے سیل رہی تھی۔ اب اس نے اپنی سرسبزی کو ہرا کیا کچھ پھول تھے تو روشنی بغیر ٹھٹھر رہے تھے، وہ بھی چہک کر رنگ نکال لائے۔ غرض ہر شے کی طبیعت اپنی اصلیت پر آکر شگفتگی کے جوش سے کھل گئی اور خوشبوؤں سے عالم مہک گیا۔

روئے زمین پر بہار کا یہ عالم دیکھ کر سلطان آسمانی نے بھی حکم دیا کہ سامنے سے پردے اٹھا دو۔ عالم بالا کے پاک نہادوں نے گل دستے ہاتھوں میں لے لئے اور خوش ہو کر پھول اچھالنے لگے۔

جب اس پہاڑ کو گلوں سے گل زار اور شادابی سے نو بہار دیکھا تو علم تعمیر وہاں آیا اپنے کمال سے ایک محل عالی شان تیار کیا۔ بہار نے کوسوں تک گل زار لگایا طرح طرح کے اوزار کام میں آئے، سڑکیں نکالیں۔ اتار چڑھاؤ درست کئے، ریلیں جاری کیں، جا بجا فرودگاہیں اور ان میں مہمان خانے اور آرام خانے بنائے۔ غرض عجائبات و غرائبات سے سجا کر ایسا طلسمات کر دیا کہ جس کے دیکھنے سے آنکھوں کو طراوت اور خیالات کو بلندی و وسعت حاصل ہو اور تصنیفات میں ایجاد اور مضمون آفرینی کے لئے سامان بہم پہنچیں۔ چنانچہ ملکہ نے یہیں سکونت اختیار کی قسمت نے آکر انعاموں کا دروازہ کھول دیا۔ صداقت جانچتی تھی۔ اور عدل بے رو رعایت دئے جاتا تھا۔ یہ دروازہ رات دن کھلا رہتا تھا۔ امید دروازے پر بیٹھی رہتی تھی اور جن کی علوم و فنون سفارش کرتے تھے انھیں بلا لیتی تھی۔ تمام دربار کثرت خلائق سے بھرا رہتا تھا اور ہر چند اکثر اشخاص ناکام بھی جاتے تھے۔ مگر شکایت کوئی نہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ خود ملکہ کی آنکھ کسی سے غافل نہ تھی جو لوگ وہاں سے ناکام پھرتے تھے ان کا نام نالائقوں کی فہرست میں درج ہو جاتا تھا۔ پھر وہ عالم شہرت سے خارج ہو کر یا تو گم نامی کے گوشے میں بیٹھ جاتے تھے کہ کوئی انھیں پوچھتا نہ تھا۔ یا ہیچ در پوچ اور واہیات کاموں پر جھک پڑتے تھے بعض ایسے بھی ہوتے تھے کہ محنت سے مدد لیتے تھے اور پھر اپنے نقص کی تکمیل میں کوشش کرتے تھے۔

اب اہل نظر غباری عینکیں لگالیں کہ بے کمالوں کے دلوں کے غبار آندھی ہو کر اٹھتے ہیں۔ ان کے اقبال کا دور آیا ہے۔

ناکاموں میں اکثر نااہل ایسے بھی تھے کہ نہ اپنی ناکامی پر شرمندہ ہوتے تھے۔ نہ شرمندگی کے گوشے میں بیٹھتے تھے۔ چند روز کے بعد ان کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ ایک دن سب نے محل کو گھیر لیا اور باغ میں آکر بستر ڈال دیئے ہر چند ملکہ نذکور کا جوہر اخلاقی تھا، مگر باپ کی طرف سے پیوند خاکی تھا اس لئے تجویز میں کچھ نہ کچھ چوک بھی ہوئی تھی۔ اور اگرچہ اس خطا کی اصلاح بہت جلد ہو جاتی تھی، مگر پھر بھی حریف جو تاک میں لگے ہوئے تھے، انھیں کہیں نہ کہیں موقع گرفت کا ہاتھ لگ ہی گیا۔ چنانچہ انھوں نے کچھ اپنے رفیقوں کے گھروں میں کمیٹیاں شروع کر دیں اور آپس ہی میں نالش اور اپیل کے سے ڈھنگ ڈال دیئے۔ تمام عالم میں رفاہ عام، رفاہ عام اور اصلاح، اصلاح کا نام کر کے فریاد مچا دی جس سے جمعیت بے شمار اکٹھی ہو گئی۔ صبح و شام جمع ہوتے۔ لمبی لمبی تقریریں کرتے۔ مگر اس میں مطلب کا نام نہیں، جھوٹ موٹ کی بکواسیں کرتے جنہیں دلیل سے کام نہیں۔ کوئی سرو قد بن کر رائے دیتا۔ کوئی شمشاد ہو کر رائے شامل کرتا۔ کوئی تائید کرتا، کوئی تسلیم کرتا۔ آپ ہی اتفاق رائے کر لیتے۔ آپ ہی واہ واہ کر لیتے۔ اسی تودۂ طوفان کو لکھتے اور پروسیڈنگ درو ئداد نام رکھتے جسے مشتہر کر کے بڑے فخر کیا کرتے۔

ان ناکاموں کی امید سے راہ تھی اور بے حیائی ان کی بڑی خیر خواہ تھی۔

چنانچہ وہ ہمیشہ ان کو ملکہ کے دربار کی طرف ڈھکیلتی رہتی تھی کہ چلو اور دوبارہ دعویٰ پیش کرو۔ اگرچہ وہاں سے دھکے کھاتے تھے اور جب جاتے نکالے جاتے تھے اس پر بھی امید کا یہ حال تھا کہ ان کی رفاقت چھوڑتی نہ تھی اور بے حیائی برابر زور لگائے جاتی تھی۔ غرض ان اندرونی راہوں کے ساتھ انھوں نے ایک اور رستہ نکالا۔ یعنی خیال کیا کہ یہ جمعیت ہماری جو امید کی حمایت اور بے حیائی کی عنایت سے روز افزوں ہے اس کی کثرت ہمیں ضرور فتح یابی بخشے گی۔ پس جس طرح ہو سکے اپنی بھیڑ بھاڑ کو بڑھانا چاہیے۔

جب پروردگار کسی بندۂ خاص کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اپنے بندوں کے کام اس کے سپرد کرتا ہے تو خواہ مخواہ کے خیر خواہ مشورت دینے کو بہت پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر دیکھو ان کی باتوں میں آکر حقیقت اور واقعیت کو نہ بھول جانا چاہیے۔ خیال کر کے سنو یہ خیر خواہ کیسے کیسے ہوتے ہیں۔

ادھر تو بے لیاقت اہل فساد نے یہ سامان بہم پہنچائے ادھر یہ قدرتی پیچ پڑا کہ ملکہ کو آسمان سے اترے ہوئے مدت ہوئی تھی۔ عالم خاک میں آکر نیت اس کی پستی کی طرف زیادہ تر مائل ہونے لگی اور عدل و انصاف کی نصیحتیں سب بھول گئی۔ یا تو صحبت اس کی علوم و فنون سے تھی یا غرور سے دوستی ہو گئی، آرام اور غفلت کو مصاحبت میں لے لیا اور رفتہ رفتہ غرور سے ایسی رسم و راہ بڑھی کہ اس سے شادی ہو کر دو لڑکیاں بھی پیدا ہو گئیں۔ ایک ان میں سے خوشامد اور دوسری خام خیالی۔ خوشامد نے نباضی سے

فیض تعلیم پایا تھا اور خام خیالی نے قسمت سے۔

غرور کے محل میں بی بی خود پسندی بھی تھیں، جن کا اس نے دودھ پیا تھا۔ دوسری دایہ خود رائی تھی، اس نے پالا تھا۔ ملکہ علم افروز نے یہ غضب کیا کہ ساری خو بو خاوند کی اختیار کر لی۔ رفتہ رفتہ خود رائی کی صلاح سے فیصلے اور خود پسندی کے دستخط سے احکام جاری ہونے لگے۔ صداقت نے جو جو سبق پڑھائے تھے سب بھلا دیئے اور عدل تو بیکار ہی ہو گیا جب ان مصاحبوں کے اختیار اور لڑکیوں کی محبت زیادہ ہوئی تو علوم کا زور بالکل گھٹ گیا۔ اس کے رفیق اور قدردان دربار سے بند ہو گئے۔ وہ بچارے بجھے چراغوں کی طرح طاقوں میں پڑے رہتے۔ ملکہ کا منہ دیکھنا بھی نصیب نہ ہوتا۔ انجام اس کا یہ ہوا کہ علوم و فنون کے خدمت گزار محنتیں کر کے راتوں کو صبح اور صبحوں کو رات کرتے، برسوں کی دستکاریوں میں اپنے کمال ظاہر کرتے مگر صلہ کے نام خاک بھی نہ پاتے۔ البتہ ان میں بھی جو چالاک ہوتے اور خام خیالی اور خوشامد کی وساطت سے وہاں تک جا پہنچتے، ان کے لئے سب کچھ موجود تھا۔

جب ارکان سلطنت کی بے اعتدالیاں حد سے گذر جائیں تو اہلِ فساد کیوں نہ سر اٹھائیں۔

جب دربار کا رنگ اس طرح بے رنگ ہوا۔ نہ علوم کے قدردان وہاں رہے نہ فنون کے جوہر شناس، تو چرچے اس کے جابجا پھیلے اور ان نالائقوں کو بھی خبریں پہنچیں، جن کی علوم سفارش نہ کرتے تھے۔ چنانچہ یہ خبریں سن کر

ان کے ہاں بڑی خوشیاں ہوتی تھیں۔ وہ ملکہ کے دل سے دشمن بدخواہ تھے۔ ان باتوں کو اس کے زوال دولت کے آثار سمجھ کر اپنی کامیابی کی تدبیروں میں زیادہ سر گرم تھے۔ ادھر ملکہ کے دربار کا یہ حال تھا کہ امید خام خیالی کے آنے سے خوش تھی۔ ادھر بے حیائی اپنے یاروں کو خوشامد کے سپرد کرتی جاتی تھی۔ دشمن مخفی جو شیطانوں کی طرح لپٹے ہوئے تھے ملکہ کو ان کا خیال بھی نہ تھا۔

حضرت انسان کا قاعدہ ہے کہ جب اپنے اوج پر آتے ہیں تو اصلیت کو بھول جاتے ہیں۔ اچھوں کو گھٹاتے ہیں۔ بروں کو بڑھاتے ہیں۔ اور ویسے ہی اپنے کیے کی سزا پاتے ہیں۔

مقام افسوس یہ ہے کہ اب ملکہ کی شان شاہی نہ رہی۔ دکھاوے کی رسموں پر آ گئی۔ زبانی خرچ بہت۔ باقی ندارد۔ مبالغے۔ استعارے بلند پروازیاں۔ لفاظیاں حد سے زیادہ مضمون مدعا غائب۔ کتابیں جلدیں کی جلدیں مطلب پڑھو تو ایک حرف نہیں۔ یا تعریف اور خوشامد یا بے لطف اور بے معنی عبارتیں۔ انجام یہ ہوا کہ فقط اوپر اوپر کے تزک و احتشام تھے اندر کچھ نہ تھا۔ یا تو ہر عرضی فوراً سنی جاتی تھی اور ہر بات پر خاطر خواہ توجہ ہوتی تھی یا باہر ایک ایوان بنوا کر اس کا نام منتظر خانہ رکھا گیا کہ امیدوار وہاں جا کر حاضر ہوا کریں۔ جن لوگوں کو بے حیائی خوشامد کے سپرد کرتی تھی وہ بے روک اس گھر میں چلے جاتے تھے۔ کوئی مزاحم نہ ہوتا تھا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ رنگ برنگ کا آدمی دربار میں آ کر بھر گیا۔ ملک ملک کے لوگ چلے آتے تھے اور فقط حمایتوں کے بھروسے پر اس جوش و خروش سے اظہار کمال اور امتحان دینے کو بڑھتے تھے کہ ایک ہم

ایک کرتا تھا۔

جب دربار کا رنگ بگڑتا ہے تو غرض مندوں کے خیالات اس سے زیادہ بگڑ جاتے ہیں، مگر تم یہ خیال کرو کہ اس عالم میں غریب غرض مندوں پر کیا گذرتی ہے۔

جو لوگ اس دربار میں شریک ہوتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ ہم ملکہ کی خدمت میں پہنچ گئے کیوں کہ ان کے لئے بڑا قوی وسیلہ تھا یعنی خوشامد۔ خوشامد کے ہاں حقیقت اور واقعیت دونوں کو دخل نہیں۔ مگر اکثر ایسا تھا کہ وہاں سے معاملہ قسمت پر جا پڑتا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اندر کا دروازہ خام خیالی کے سپرد تھا اور وہ اپنے دل کی راجہ تھی۔ جب چاہتی تھی کھول دیتی تھی جب چاہتی تھی بند کر دیتی تھی۔ غرض کہ بد نصیب غرض دار اپنی ساری عمر عزیز اس بدحالی میں برباد کرتے تھے کہ کبھی آس کبھی بے آس۔ ابھی خوش ابھی اداس۔ اس ایوان کے اندر وسواس داروغہ تھا اور امیدواروں کا یار بنا ہوا تھا۔ وہ دم بدم آتا تھا اور ایسی ایسی باتیں کان میں پھونک جاتا تھا کہ جن کا پورا ہونا قیامت تک ممکن نہ ہو۔ اور امید کہتی تھی کہ ہاں ہاں، اب حسن قبول کا خلعت دلواتی ہوں۔

ساتھ ہی اس کے رشک ڈیوڑھی کا داروغہ تھا۔ اس کے گھر میں رات دن آگ پڑی رہتی تھی۔ یہ سب اس کی سپردگی میں تھے۔ اور باوجودیکہ اس حال تباہ میں گرفتار تھے مگر بد قسمتی یہ کہ اب بھی اتفاق نہ کرتے تھے۔ ایک ایک کو دیکھتے تھے اور جلے مرتے تھے اور آپس میں لڑتے تھے۔

عمارت مذکور میں اندھیر چھایا تھا۔ دیواروں پر الو بول رہے تھے۔ گردبدنامی کی چمگادڑیں اڑتی پھرتی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں علم کی شعاعیں سوئیاں ہو کر چبھتی تھیں اور پروں سے ایسی خرابی و خواری کی بوندیں جھاڑتی تھیں کہ جس پر گرتی تھیں داغ پڑ جاتا تھا۔

یہ بے ہودہ بے کمال اور نکتہ چین معترض ہیں۔ ہنرمندوں کے ہنر ان کی آنکھوں میں چبھتے ہیں اور خواہ مخواہ عیب لگا کر ان کی تصنیفات خراب کرتے ہیں۔ حق داروں کا حق بھی کچھ نہ کچھ زور رکھتا ہے مگر نہ اس قدر کہ طوفان نوح کا مقابلہ کر سکے۔

ہرچند جس شخص کے داغ لگتا تھا نیک نامی بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیتی تھی۔ مگر خدا جانے بڑھاپا تھا یا بیماری کا ضعف تھا کہ بہت آہستہ آہستہ چلتی تھی۔ یہ بے چاری ہرچند کوشش کرتی تھی کہ کسی طرح اپنا رنگ پھیر کر اس دھبے کو چھپا دے۔ لیکن خرابی یہ تھی کہ اس کا رنگ بہت کچا تھا۔ ذرا سا پانی لگنے سے یا دھوپ میں رہنے سے اڑ جاتا تھا۔ اس سے دھبے اور بھی روشن ہو جاتے تھے اور بدنامی کے داغ کبھی نہ مٹتے تھے۔ البتہ صداقت کے تخت کے نیچے ایک چشمہ جاری تھا۔ اس کے پانی سے خوب دھوئے جاتے تھے، مگر وہاں سے اس پانی کا آنا مشکل تھا۔ ہاں اگر لاتا تھا تو وقت ہی لاتا تھا۔

طوفان بے تمیزی میں قدم رکھنے کو جگہ ملے تو بھی گوشہ گیری ہی ہنر ہے

چوں کہ علوم کا دل گوارا نہ کرتا تھا کہ اپنے معتقدوں کو اس طرح تنہا ہی

کی حالت میں دیکھیں اس لئے اکثروں کو لے لیتے۔ چنانچہ وہ بھی تاک میں لگے
رہتے تھے اور جب موقع پاتے کسی نہ کسی ڈھب سے ملکہ کی خلوت میں جا
پہنچاتے تھے۔ ملکہ دیکھ کر فقط ابرو کا اشارہ کر دیتی تھی۔ یعنی منتظر خانہ میں
حاضر ہوں۔ وہاں کوئی ان کی سنتا نہ تھا۔ کیوں کہ ان بیچاروں کو نہ فقط رشک
بلکہ وسواس بھی ستاتا۔ بے حیائی ایک چیخ مار کر کہتی تھی کہ کیوں خواہ مخواہ گھس آئے۔
اور بدنامی کو اشارہ کرتی تھی کہ جاؤ داغ لگا دو۔ اخباروں میں چھاپ دو۔ اشتہار دیدو۔ سارے
جہان میں رسوا کر دو۔ یہ بیچارے گھبرا کر گرتے پڑتے بھاگتے تھے۔ کسی کی کتاب چھپٹ پڑتی تھی کسی کا
عمامہ رہ جاتا تھا۔ مگر اکثر داغ بھی کھاتے تھے۔ جو جو داغ لگ جاتے تھے وہ
نہایت مشکل سے دھوئے جاتے تھے اور جن کے وہ داغ لگا تھا لوگ دور
ہی سے تاڑ جاتے تھے کہ یہ ضرور کبھی نہ کبھی منتظر خانہ کی ہوا کھا آئے ہیں۔
غرض مند بچارے ہر طرح ادائے خدمت کو حاضر ہیں۔ کاش کہ وہاں
قبول ہو۔ باقی امیدوار اس مبارک گھڑی کے انتظار میں بیٹھے رہتے تھے
کہ کب خام خیالی اندر آنے کو اشارہ کرے اور کب ہم حضور میں باریاب ہوں۔
یہ غرض مند بچارے احتیاج کے مارے اُسے خوش بھی کرتے تھے۔ مگر نہ
فصاحت اصلی یا اشعار واقعی یا خیال عالی سے بلکہ برخلاف اس کے
جھوٹی داستانیں، عاشقانہ افسانے، زٹلیات، ڈھکوسلے کہ ان میں ملکہ
کی بھی تعریف ہوتی تھی اور اس کے شوہر یعنی غرور کی بھی خوشامد ہوتی تھی۔
غضب یہ تھا کہ وہاں یہ بھی ایک آدھ ہی دفعہ سنی جاتی تھی۔ کچھ تو خوش طبعی
چٹکیوں میں اڑا دیتی تھی۔ کچھ بد دماغی کی چپیں جبیں میں چلے جاتے تھے۔

بعض اشخاص خام خیالی کی بدولت دربار تک پہنچ بھی گئے اور ملکہ نے قسمت سے انعام بھی ایسے ایسے دلوائے جن کی انھیں خود بھی اُمید نہیں تھی۔ مگر تخت کے پا انارا زمیں کچھ سونے کی زنجیریں پڑی تھیں جھٹ گلے میں ڈالیں اور وہیں باندھ دیا کہ ہر دم زیر نظر رہو مگر اشاروں پر کام کرو اور اسی طرح زندگی بسر کردو۔ لطف یہ تھا کہ لوگ ان زنجیروں کو پہن کر فخر کرتے تھے اور کیسے ہی نازیبا اور بے عزتی کے کام ہے۔ بلکہ گالیاں بھی دے تو پیشانی پر بل نہ لاتے تھے۔ اس پر خام خیالی جب چاہتی تھی پکڑ لیتی تھی اور زیور و لباس اتار پھر منتظر خانے میں ڈھکیل دیتی تھی۔

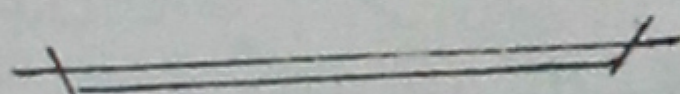
یہ لوگ وہاں آکر پھر طوفان بے تمیزی کی بھیڑ میں مل جاتے تھے۔ وہاں بعض اشخاص جنھیں تجربہ کی نصیحت نے کچھ اثر کیا تھا وہ تو کسی اور رستے سے ہو کر نکل گئے اور کوئی اور خوش حال کی راہ ڈھونڈھ لی۔ باقی وہیں پڑے رہے۔ عمر گذارا کئے اور خوشامد کے ذریعہ سے خام خیالی کو خوش کرتے رہے۔ اتنے میں ایک اور بھیڑ کا ریلا آگیا۔ چنانچہ جب جگہ نے تنگی کی تو گرد مکان مذکور کے بہت سے کمرے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کو حیثیت کے بموجب بیماری، کاہلی، سستی، شرمندگی، مایوسی کے کمرے میں ڈال دیا۔ کہ وہاں وعدے اور وعدہ شکنی، خوشی، اور ناخوشی، امید اور ناامیدی میں زندگی کے دن پورے کرتے رہیں۔ اور آخر ملک عدم کو چلے جائیں۔

دیکھو صبح کے رستے بھولے ہوئے شام کو گھر آتے ہیں۔

علوم و فنون نے بھی بہت سے دھکے کھا کر معلوم کیا کہ اب اس جہان

میں رہنا عزت نہیں بلکہ بے عزتی ہے۔ ملکہ کے محل سے نکلے۔ تمام دنیا میں پھرے۔ تکلیف و مصیبت کے سوا کچھ نہ پایا۔ اتفاقاً ایک سبزہ زار میں گذر ہوا۔ ایک بہتے چشمے کے کنارے پر کچھ چھوٹے چھوٹے مکان اور کئی جھونپڑیاں نظر آئیں۔ معلوم ہوا کہ آزادی کی آرام گاہ یہی ہے۔ وہ تحمل کی بیٹی تھی اور قناعت کی گود میں پلی تھی۔ چنانچہ سب سے الگ اس گوشۂ عافیت میں پڑی رہتی تھی اور کنج عافیت اس کا نام رکھا تھا۔ یہ مقام علوم و فنون کو بھی گذران کے قابل معلوم ہوا۔ وہاں جا کر دیکھا تو دانائی، دور اندیشی، کفایت شعاری بھی موجود ہیں۔ علوم نے چند روز تک ان کی صحبت کو غنیمت سمجھا اور آزادی کے دامن کے نیچے اپنی عزت اور آسائش کو چھپا کر زندگی بسر کرنے لگے۔ اے اہلِ علم! اب وہی زمانہ ہے۔ عزت و آسائش چاہو تو اس طرح گذارہ کرو۔

کیوں آزاد! مجھے تو ان لوگوں پر رشک آتا ہے جو شہرت کی ہوس یا انعاموں کی طمع پر خاک ڈال کر گوشۂ عافیت میں بیٹھے ہیں اور سب بلاؤں سے محفوظ ہیں۔ نہ انعام سے خوش نہ محرومی سے ناخوش، نہ تعریف کی تمنا نہ عیب چینی کی پروا۔ اے خدا دل آزاد دے اور حالت بے نیاز۔



مرزا ظاہر دار بیگ

توبۃ النصوح سے مقتبس ہے اور دہلی کی ٹکسالی زبان کا بہترین نمونہ ہے۔ سادگی ادا اور سلاست خاص طور سے قابل تقلید ہے۔ محاورات بکثرت ملتے ہیں اور مختلف طبقوں کی زبان میں فرق ہر مقام پر نمایاں ہیں

قصہ کوتاہ کلیم شیخ چلی[1] کے سے منصوبے سوچتا ہوا اپنے دوست مرزا کے مکان پر پہونچا۔ ہرچند ابھی کچھ ایسی[2] بہت رات نہیں گئی تھی۔ لیکن مرزا جیسے نکھے بے فکرے کبھی کی لمبی تان کر سو چکے تھے۔ کلیم نے جو دروازے پر دستک دی تو جواب ندارد[3]۔ اس مقام پر مرزا کا تھوڑا سا حال لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اس شخص کی کیفیت یہ تھی کہ شاید اس کا نانا۔ وہ بھی حقیقی نہیں عملداری سرکار[4] میں صاحب رزیڈنٹ کی اردلی[5] کا جماعہ دار[6] تھا۔ اول تو ایسی عالی جاہ سرکار۔ دوسرے باعتبار منصب اردلی کا جماعہ دار۔ تیسرے ان دنوں کی بے عنوانی پر خود اس کی رشوت ستانی۔ بہت کچھ کمایا یہاں تک کہ

---

1. دور از کار منصوبوں کے لئے ایک ضرب المثل شخص کا نام ہے
2. لکھنؤ میں اس مقام پر "سے" یا "ایسے" کہتے ہیں۔
3. محاورہ۔ 4. انگریزی حکومت۔ 5. انگریزی کا لفظ اردو میں۔
6. کثرت استعمال سے "جمعدار" رائج ہوگیا ہے اور صحیح ہے۔

اس کا اعتماد[1] دلی کے رو واروں میں ہو گیا۔ مرزا کی ماں اوائل عمر ہی میں بیوہ
ہو گئی۔ جماعہ دار نے باوجودیکہ دور کی قرابت تھی حسبۃً للہ اُس کا تکفل اپنے
ذمے لیا۔ جماعہ دار اپنی حیات میں تو اتنا سلوک کرتا رہا کہ مرزا کو اپنی یتیمی اور
ماں کی بیوگی بھول کر[2] بھی یاد نہ آئی ہو گی لیکن جماعہ دار کے مرنے پر اس کے بیٹے
پوتے نواسے بکثرت تھے۔ انھوں نے بے اعتنائی کی اور اگرچہ جماعہ دار بہت
کچھ وصیت[3] کر مرے تھے۔ مگر ان کے ورثا نے بہزار دقت محلسرا کے پہلو میں ایک
بہت چھوٹا سا قطعہ اُن کے رہنے کو دیا اور سات روپے مہینے کی دکانیں مرزا
کے نام کر دیں یہ تو حال تھا۔ یکہ مرزا۔ مرزا کی ماں۔ مرزا کی بیوی۔ یہ تین آدمی
اور سات روپے کی کل کائنات[4]! اُس پر مرزا کی شیخی اور نمود! یہ مسخرہ اس ہستی
پر چاہتا تھا کہ جماعہ دار کے بیٹوں کی برابری کرے جن کی صدہا روپے ماہوار کی
کی مستقل آمدنی تھی۔ اگرچہ جماعہ دار والے اس کو منہ نہیں لگاتے تھے مگر
یہ بے غیرت زبردستی اُن میں گھسنا تھا۔ یہ کسی کو ماموں جان کسی کو خالو جان
کسی کو بھائی جان بناتا[5]۔ اور وہ لوگ اس کے ادعائی رشتوں اور ناتوں سے
دق ہوتے[6]۔ اونچی حیثیت کے لوگوں میں بیٹھنا اس کے حق میں ادکھی بول
تھا۔ اُن کی دیکھا دیکھی اس نے تمام عادتیں امیرزادوں کی اختیار کر رکھی
تھیں۔ مگر امیرزادگی نہ تھی تو کیسے نبھے۔ دکانیں گروی ہوتی جاتی تھیں۔

---

[1] شمار رائج ہے۔ [2] لکھنؤ میں کہتے ہیں "بھولے سے بھی"۔ [3] لکھنؤ کا محاورہ ہے "وصیت کر کے"۔ [4] لکھنؤ میں کہتے ہیں "اور ساری کائنات سات روپے"۔
[5] پورب میں کہتے ہیں "بناتا تھا"۔ [6] "ہوتے تھے" پورب کا محاورہ ہے۔

ماں بیچاری بہتیرا بکتی[1] - مگر کون سُنتا تھا - مرزا کو جب دیکھو پاؤں میں ڈیڑھ حاشیہ کی جُوتی - سر پر دوہری بیل کی بھاری کامدار ٹوپی - بدن میں ایک چھوڑ دو دو انگرکھے - اوپر شبنم یا ہلکی تن زیب نیچے کوئی طرحدار ساڈھاکے کا نینو - جاڑا ہوا تو بانات مگر سات روپیہ گز سے کم نہیں - خیر یہ تو صبح اور شام اور تیسرے پہر کا شانی مخمل کی آصف خانی[2] جس میں حریر کی سنجاف کے علاوہ گنگا جمنی کمخواب کی عمدہ بیل ٹکی ہوئی - سرخ نیفہ - پائجامہ اگر ڈھیلے پائچوں کا ہوا تو کلی دار اور اس قدر نیچا کہ ٹھوکر کے اشارے سے دو دو قدم آگے اور اگر تنگ مُہری کا ہوا تو نصف ساق تک چوڑیاں اور اوپر چلد بدن کی طرح مڑھا ہوا[3] ریشمی ازار بند گھٹنوں میں لٹکتا ہوا اور اس میں بے قفل[4] کی کنجیوں کا گُچھا غرض دیکھا تو مرزا صاحب اس ہیئت کذائی سے چھیلا بنے ہوئے سر بازار چھم چھم کرتے چلے جاتے ہیں -

کلیم سے اور مرزا سے محفلِ مشاعرہ میں تعارف ہوا - شدہ شدہ مرزا صاحب کلیم کے مکان پر تشریف لانے لگے - یہاں تک کہ اب چند روز سے تو دونوں میں ایسی گاڑھی چھننے لگی کہ گویا ایک جان دو قالب تھے - کلیم کو تو مرزا کے مکان پر جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا - مگر مرزا شام

[1] "بکتی تھی" پورب کا محاورہ - [2] یہاں سے بغور پڑھنا چاہیے - شاہی اور ابتدائی انگریزی زمانے کی وہم کے امر کی وضع بالکل ٹھیک ٹھیک لکھی ہے -
[3] لکھنؤ میں کہتے ہیں "منڈھا ہوا" [4] ناداری کی طرف طنزیہ اشارہ [5] محاورہ تھا -
[6] محاورہ ہے یعنی رفتہ رفتہ - [7] محاورہ

کوتو کبھی کبھی لیکن صبح کو بلا ناغہ آتے[1] اور تمام دن کلیم کے پاس رہتے۔ مرزا نے اپنا اصلی حال کلیم پر ظاہر نہیں ہونے دیا کلیم بھی جانتا تھا کہ جماعہ دار کا تمام ترکہ مرزا کو ملا ہے اور جماعہ دار کی محلسرا کو مرزا کی محلسرا اور جماعہ دار کے دیوان خانے کو مرزا کا دیوان خانہ اور جماعہ دار کے بیٹے پوتے کے نوکروں کو مرزا کے نوکر سمجھتا تھا اسی غلط فہمی میں وہ گھر سے نکلا تو سیدھا جماعہ دار کی محلسرا کی ڈیوڑھی پر جا موجود ہوا۔ بار بار کے پکارنے اور کنڈی کھڑکھڑانے سے دو لونڈیاں چراغ لیے ہوئے اندر سے نکلیں اور ان میں سے ایک نے پوچھا "کون صاحب ہیں اور اتنی رات گئے کیا کام ہے"

کلیم۔ جاؤ۔ مرزا کو بھیج دو۔

لونڈی۔ کون مرزا۔

کلیم۔ مرزا ظاہر دار بیگ جن کا مکان ہے اور کون مرزا۔

لونڈی۔ یہاں کوئی ظاہر دار بیگ نہیں ہے۔

اتنا کہہ کر قریب تھا کہ لونڈی پھر کنواڑ[2] بند کرے کہ کلیم نے کہا "کیوں جی! کیا یہ جماعہ دار صاحب کی محلسرا نہیں ہے۔

لونڈی۔ ہے کیوں نہیں۔

کلیم۔ پھر تم نے یہ کیا کہا کہ یہاں کوئی ظاہر دار بیگ نہیں۔ کیا ظاہر دار بیگ جماعہ دار کے وارث اور جانشین نہیں ہیں؟

---

[1] ایسے مقام پر لکھنؤ میں "تھے" ضرور اضافہ کرتے ہیں۔

[2] لکھنؤ میں فصیح زبان ہے "کنواڑے بند کرے"۔

لونڈی۔ جماعہ دار کے وارثوں کو خدا سلامت رکھے[1] موا[2] طاہردار بیگ جماعہ دار کا دارث بننے والا کون!

دوسری لونڈی۔ ارے کمبخت[3] یہ کہیں مرزا باتکے کے بیٹے کو پوچھتے ہوں؟ وہ ہر جگہ اپنے تئیں جماعہ دار کا بیٹا بتایا کرتا ہے (کلیم کی طرف مخاطب ہوکر) کیوں میاں! وہی طاہروار بیگ نا! جن کی رنگت زرد رو ہے۔ آنکھیں کرنجی۔ چھوٹا قد۔ دُبلا ڈیل۔ اپنے تئیں بہت بنائے سنوارے رہا کرتے ہیں[4]۔

کلیم۔ ہاں! ہاں! وہی طاہردار بیگ!

لونڈی۔ تو میاں! اس مکان کے پچھواڑے اُپلوں کی ٹال کے پاس ایک چھوٹا سا کچا مکان ہے وہ اس میں رہتے ہیں۔

کلیم نے وہاں جاکے[5] آواز دی تو کچھ دیر بعد مرزا صاحب ننگ دھڑنگ[6] جانگیہ[7] پہنے باہر تشریف لائے[8] اور کلیم کو دیکھ کر شرمائے اور بولے۔

"آہا! آپ ہیں! معاف کیجئے گا! میں نے سمجھا کوئی اور صاحب ہیں بندے کو کپڑا پہن کے سونے کی عادت نہیں۔ ذرا کپڑا پہن آؤں تو آپ کے ہمراہ رکاب چلوں۔

کلیم:۔ چلئے گا کہاں؟ میں آپ کے پاس تک آیا تھا۔

---

[1] ملازموں کی تہذیب [2] عورتوں کی زبان [3] کم حیثیت عورتوں سے خطاب اور مکالمہ [4] عوام کے مذاق اور گفتگو کا نہایت صحیح چربا ہے [5] لکھنؤ کا محاورہ ہے "جاکے" [6] محاورہ ہے [7] لکھنؤ کے عوام جانگیہ کہتے ہیں۔ [8] طنزیہ۔

مرزا۔ پھر اگر کچھ دیر تشریف رکھنا ہو تو میں اندر پردہ کراؤں۔
کلیم۔ میں آج شب کو آپ کو یہاں رہنے کی نیت سے آیا ہوں۔
مرزا۔ بسم اللہ! تو چلئے۔ اسی مسجد میں تشریف رکھئے بڑی فضا کی جگہ ہے۔ میں ابھی آیا!

کلیم نے مسجد میں آکے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک نہایت پرانی چھوٹی سی مسجد ہے۔ وہ بھی مسجد ضرار[1] کی طرح ویران! وحشت ناک! نہ کوئی حافظ ہے نہ ملا۔ نہ طالب العلم۔ نہ مسافر۔ ہزارہا چمگادڑیں اس میں رہتی ہیں کہ ان کی تسبیح بے ہنگام سے کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ فرش پر اس قدر بیٹ پڑی ہے کہ بجائے خود کھرنجے کا فرش بن گیا ہے۔ مرزا کے انتظار میں کلیم کو چار و ناچار اسی مسجد میں ٹھہرنا پڑا۔ مرزا آئے بھی تو اتنی دیر بعد کہ کلیم مایوس ہو چکا تھا۔ قبل اس کے کہ کلیم شکایت کرے۔ مرزا صاحب بطور دفع دخل مقدر[2] فرمانے لگے کہ بیچارے کے گھر میں[3] کئی دن سے طبیعت علیل ہے۔ خفقان کا عارضہ۔ اختلاج قلب کا روگ ہے۔ اب جو میں آپ کے پاس سے گیا تو ان کو غشی میں پایا۔ اس وجہ سے دیر ہوئی پہلے یہ تو آپ فرمایئے کہ اس وقت بندہ نوازی فرمانے کی کیا وجہ ہے۔ کلیم نے باپ کی طلب اپنا انکار۔ بھائی کی التجا۔ ماں کا اصرار۔ تمام ماجرا کہہ سنایا

---

[1] پیغمبر اسلام کے بعض مخالفوں نے ایک مسجد بنائی تھی جہاں آپ کو نقصان پہونچانے کیلئے مشورہ کرتے تھے۔ طنزیہ تشبیہ [2] علمی لطیف ظرافت کی مثال [3] بیوی کی محاورہ ہے گذشتہ واقعات کی طرف اشارہ ہے۔

مرزا۔ پھر آپ کا کیا ارادہ ہے؟

کلیم۔ سوائے اس کے کہ اب گھر لوٹ جانے کا تو ارادہ نہیں ہے۔ اور جو آپ کی صلاح ہو۔

مرزا۔ خیریت شب حرام! صبح تو ہو! آپ بے تکلف استراحت فرمائیے۔ میں جا کے بچھونا وغیرہ بھیجے دیتا ہوں اور مجھ کو مریضہ کی تیمارداری کے لئے اجازت دیجئے کہ آج اُس کی علالت میں اشتداد ہے۔

کلیم۔ یہ ماجرا کیا ہے؟ تم تو کہا کرتے تھے کہ ہمارے یہاں دوہری محلسرائیں متعدد دیوان خانے۔ کئی پائیں باغ ہیں۔ حوض اور حمام اور کٹڑے اور گنج اور سرائیں ہیں۔ میں تو جانتا ہوں کہ عمارت کی قسم سے کوئی ایسی چیز نہ ہوگی کہ جس کو تم نے اپنی ملک نہ بتایا ہو۔ یا یہ حال ہے کہ ایک متنفس کے واسطے ایک شب کے لئے تم کو جگہ میسر نہیں جو جو حالات تم نے اپنی زبان سے کہے ہیں اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ جمعہ دار کے تمام ترکہ پر تم قابض اور متصرف ہو لیکن میں اُس تمام جاہ و حشمت کا ایک شمہ نہیں دیکھتا۔

مرزا۔ آپ کو میری نسبت سخن سازی کا احتمال ہونا سخت تعجب کی بات ہے۔ اتنی مدت مجھ سے آپ سے صحبت رہی مگر افسوس ہے کہ آپ نے میری طبیعت اور عادت کو نہ پہچانا۔ یہ اختلاف حالت جو آپ دیکھتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ ہے۔ جمعہ دار صاحب نے مجھ کو

---

[۱] محاورہ ہے کیونکہ عام خیال یہ ہے کہ جو ارادہ رات کو کیا جاتا ہے۔ وہ پورا نہیں ہوتا۔

متبنٰی کیا تھا اور اپنا جانشین کر مرے[1] تھے۔ شہر کے کُل رؤسا اس سے واقف اور آگاہ ہیں۔ اُن کے انتقال کے بعد لوگوں نے اس میں رخنہ اندازیاں کیں۔ بندے کو آپ جانتے ہیں کہ بکھیڑے سے کوسوں بھاگتا ہے۔ صحبت ناملائم دیکھ کر کنارہ کش ہوگیا لیکن کسی کو انتظام کا سلیقہ۔ بندوبست کا حوصلہ نہیں۔ اُسی روز سے اندر باہر واویلا مچی ہوئی ہے۔ اور اس بات کے مشورے ہو رہے ہیں کہ بندے کو منالے جائیں۔

کلیم۔ لیکن آپ نے اس کا تذکرہ کبھی نہیں کیا؟

مرزا۔ اگر میں آپ سے یا کسی سے تذکرہ کرتا تو استقلال مزاج سے بے بہرہ اور غیرت و حمیت سے بے نصیب ٹھہرتا۔ اب آپ کو کھڑے رہنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ اجازت دیجئے کہ میں جا کے بچھونا بچھوا دوں اور مریض کی تیمارداری کروں۔

کلیم۔ خیر! مقام مجبوری ہے۔ لیکن پہلے ایک چراغ تو بھیج دیجئے تاریکی کی وجہ سے طبیعت اور بھی گھبراتی ہے۔

مرزا۔ چراغ کیا۔ میں نے تو لمپ روشن کرانے کا ارادہ کیا تھا لیکن گرمی کے دن ہیں۔ پروانے بہت جمع ہو جائیں گے اور آپ زیادہ پریشان ہو جیئے گا اور اس مکان میں ابابیلوں کی کثرت ہے۔ روشنی دیکھ کے گرنی شروع ہوں گی اور آپ کا بیٹھنا دشوار کر دیں گی۔ تھوڑی دیر صبر کیجئے کہ ماہتاب[2]

---

[1] دہلی کا مخصوص محاورہ۔ لکھنؤ میں "کر کے" کہا جائے گا۔

[2] صحیح چاندنی مگر عام زبان میں چاند کو بھی کہتے ہیں۔

نکلا آتا ہے۔

کلیم جب گھر سے نکلا تھا تو کھانا تیار تھا۔ لیکن وہ اس قدر طیش میں تھا کہ کھانے کی مطلق پروانہ کی اور بے کھائے نکل کھڑا ہوا۔ مرزا سے ملنے کے بعد وہ منتظر تھا کہ آخر مرزا خود پوچھیں ہی گے تو کہدوں گا۔ مرزا کو ہرچند کھانے کی نسبت پوچھنا ضرور تھا۔ کیونکہ اول تو کچھ ایسی زیادہ رات نہیں گئی تھی۔ دوسرے یہ کہ اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ کلیم گھر سے لڑ کر نکلا ہے۔ تیسرے دونوں میں بے تکلفی نہایت درجہ کی تھی۔ لیکن مرزا قصداً اس بات سے متعرض نہ ہوا اور کلیم بیچارے کا بھوک کے مارے یہ حال کہ مسجد میں آنے سے پہلے اس کی انتڑیوں نے قل ہو اللہ[1] پڑھنی شروع کر دی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ مرزا کسی طرح اس پہلو پر نہیں آتا اور عنقریب تمام شب کے واسطے رخصت ہوا چاہتا ہے تو بیچارے نے بے غیرت بن کے خود کہا کہ سنو! یار! میں نے کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔

مرزا۔ سچ کہو! نہیں جھوٹ! بہکاتے ہو۔

کلیم۔ تمہارے سر کی قسم بھوکا ہوں۔

مرزا۔ مرد خدا! تو آتے ہی کیوں نہ کہا۔ اب اتنی رات گئے کیا ہو سکتا ہے دکانیں سب بند ہو گئیں اور جو دو ایک کھلی بھی ہیں تو باسی چیزیں رہ گئی ہوں گی۔ جن کے کھانے سے فاقہ بہتر ہے گھر میں آج آگ تک نہیں سلگی مگر ظاہرا تم سے بھوک کی سہار[2] ہونی مشکل معلوم ہوتی ہے۔ دیوا شتہا کو

---

[1] لکھنؤ کا محاورہ ہے آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ [2] تمہیں بھوک کی تاب "لکھنؤ کا محاورہ ہے۔

زیر کرنا بڑی ہمت والوں کا کام ہے۔ ایک تدبیر سمجھ میں آتی ہے کہ جاؤں چھدامی بھڑ بھونجے کے یہاں سے گرم گرم خستہ چنے کی دال بھنوا لاؤں۔ بس ایک دھیلے کی مجکو تم کو دونوں کو کافی ہو گی رات کا وقت ہے۔

ابھی کلیم کچھ کہنے نہیں پایا تھا کہ مرزا جلدی سے اٹھ کے باہر گئے اور چشم زدن میں چنے بھنوا لائے مگر دھیلے کے کہہ کے گئے تھے یا تو کم کے لائے یا راہ میں دو چار پھنکے لگائے۔ اس واسطے کہ کلیم کے روبرو دو تین مٹھی سے زیادہ چنے نہ تھے۔

مرزا۔ یار ہو تم بڑے خوش قسمت! کہ اس وقت بھاڑ مل گیا۔ ذرا واللہ ہاتھ لگاؤ دیکھو تو کیسے بھلس رہے ہیں اور سوندھی خوشبو بھی عجب ہی دل فریب ہے کہ بس بیان نہیں کر سکتا۔ تعجب ہے کہ لوگوں نے خس اور مٹی کا عطر نکالا مگر بھنے ہوئے چنوں کی طرف کسی کا ذہن منتقل نہیں ہوا۔ کوئی فن ہو۔ کمال بھی کیا چیز ہے دیکھئے اتنی رات تو گئی ہے مگر چھدامی کی دکان پر بھیڑ لگی ہوئی ہے بندے نے تحقیق سنا ہے کہ حضور والا کے خاصے میں چھدامی کی دکان کا چبنا[1] بلا ناغہ لگ کر جاتا ہے اور واقع میں آپ ذرا غور سے دیکھئے کیا کمال کرتا ہے کہ بھوننے میں چنوں کو سوڈول[2] بنا دیتا ہے۔ بھئی! تمھیں میری سر کی قسم! سچ کہنا! ایسے خوبصورت خوش قطع سوڈول چنے تم نے پہلے بھی کبھی دیکھے دال بنا لے میں اس کو یہ کمال حاصل ہے کہ کسی دانے پر خراش تک نہیں، ٹوٹنے پھوٹنے کا کیا مذکور۔

---

[1] کمینوں کا طریقہ [2] لکھنؤ والے کہتے ہیں "دکان کے چنے" [3] لکھنؤ میں "سڈول" کہتے ہیں۔

اور دانوں کی رنگت دیکھئے کوئی بسنتی ہے۔ کوئی پستئی۔ غرض دونوں رنگ خوشنما۔ یوں تو صدہا قسم کے غلّے اور پھل زمین سے اُگتے ہیں لیکن چنے کی لذّت کو کوئی نہیں پاتا۔

زبان گویا

اے میری بلبل ہزار داستان! اے میری طوطی شیوا بیان! اے میری قاصد! اے میری ترجمان! اے میری وکیل! اے میری زبان! سچ بتا تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے؟ کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جدا ہے اور تیرے ہر پھل میں ایک نیا مزا ہے کبھی تو ایک ساحرِ فسوں ساز ہے جس کے سحر کا رد نہ جادو کا اُتار۔ کبھی تو ایک افعی جاں گداز ہے جس کے زہر کی دارو نہ کاٹے کا منتر۔ تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دکھاتی تھی۔ تو وہی زبان ہے کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کا شکار کرتی تھی اور کہیں اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی

اے میری زبان! دشمن کو دوست بنانا اور دوست کو دشمن کر دکھانا تیرا ایک کھیل ہے جس کے تماشے سینکڑوں دیکھے اور ہزاروں دیکھنے باقی ہیں۔

اے میری بنی بات کی بگاڑنے والی اور میرے بگڑے کاموں کی سنوارنے والی! روتے کو ہنسانا اور ہنستے کو رلانا۔ روٹھے کو منانا اور بگڑے کو بنانا نہیں معلوم تو نے کہاں سیکھا۔ کہیں تیری باتیں بس کی

گانٹھیں ہیں، اور کہیں تیرے بول شربت کے گھونٹ ہیں۔ کہیں تو شہد ہے اور کہیں حنظل، کہیں تو زہر ہے اور کہیں تریاق۔

اے زبان! ہمارے بہت سے آرام اور بہت سی تکلیفیں، ہمارے ہزاروں نقصان اور ہزاروں فائدے۔ ہماری عزت، ہماری ذلت، ہماری نیک نامی، ہماری بد نامی، ہمارا جھوٹ، ہمارا سچ، تیری اک ہاں اور ایک نہیں پر موقوف ہے۔ تیری اس "ہاں" اور "نہیں" نے کروڑوں کی جانیں بچائیں اور لاکھوں کا سر کٹوایا۔

اے زبان تو دیکھنے میں تو ایک پارۂ گوشت کے سوا کچھ نہیں مگر طاقت تیری نمونۂ قدرت الٰہی ہے۔ دیکھ! اس طاقت کو رائگاں نہ کھو اور اس قدرت کو خاک میں نہ ملا۔ راستی تیرا جوہر ہے اور آزادی تیرا زیور۔ دیکھ اس جوہر کو برباد نہ کر اور اس زیور کو زنگ نہ لگا۔ تو دل کی امین ہے اور روح کی ایلچی۔ دیکھ دل کی امانت میں خیانت نہ کر اور روح کے پیغام پر حاشیے نہ چڑھا۔ اے زبان تیرا منصب بہت عالی ہے اور تیری خدمت نہایت ممتاز۔ کہیں تیرا خطاب کاشفِ اسرار ہے اور کہیں تیرا لقب محرمِ راز، علم ایک خزانۂ غیبی ہے اور دل اُس کا خزانچی۔ حوصلہ اس کا قفل ہے اور تو اس کی کنجی۔ دیکھ اُس قفل کو بے اجازت نہ کھول اور اس خزانہ کو بے موقع نہ اٹھا۔ وعظ و نصیحت تیرا فرض ہے اور تلقین و ارشاد تیرا کام۔ ناصحِ مشفق تیری صفت ہے اور مرشدِ برحق تیرا نام۔ خبردار! اس نام کو عیب نہ لگانا اور اس فرض سے جی نہ چرانا۔ ورنہ یہ منصبِ عالی تجھ سے

چھن جائے گا اور تیری بساط میں صرف وہی ایک گوشت کا چھیچھڑا رہ جائے گا۔ کیا تجھ کو یہ امید ہے کہ تو جھوٹ بھی بولے اور طوفان بھی اٹھائے، تو غلیمت بھی کرے اور تہمت بھی لگائے، تو فریب بھی دے اور چغلیاں بھی کھائے اور پھر وہی زبان کی زبان کہلائے۔ نہیں ہرگز نہیں!! اگر تو سچی ہے تو زبان ہے ورنہ زبون ہے۔ بلکہ سراسر زیان ہے اگر تیرا قول صادق ہے تو شہد فائق ہے ورنہ تھوک دینے کے لائق ہے۔ اگر تو راست گفتار ہے تو ہمارے منہ میں اور دوسروں کے دلوں میں جگہ پائیگی ورنہ گدّی سے کھینچ کر نکالی جائے گی۔

اے زبان جنھوں نے تیرا کہنا مانا اور جو تیرا حکم بجا لائے، انھوں نے سخت الزام اٹھائے اور بہت پچھتائے۔ کسی نے اُنھیں مکار اور فریبی کہا، کسی نے گستاخ اور منہ پھٹ اُن کا نام رکھا۔ کسی نے ریاکار ٹھہرایا اور کسی نے سخن ساز، کسی نے بدعہد بتایا اور کسی نے غماز۔ غیبت اور بہتان مکر اور افترا، طعن اور تشنیع۔ گالی اور دشنام جھگڑا اور ضلع۔ جگت اور پھبتی غرض دنیا بھر کے عیب ان میں نکالے اور وہ سب کے سزاوار ٹھہرے۔

اے زبان! یاد رکھ ہم تیرا کہا نہ مانیں گے اور تیرے قابو میں ہرگز نہ آئیں گے۔ ہم تیری ڈور ڈھیلی نہ چھوڑیں گے اور تجھے مطلق العنان نہ بنائیں گے۔ ہم جان پر کھیلیں گے، پر تجھ سے جھوٹ نہ بلوائیں گے۔ ہم سر کے بدلے ناک نہ کٹوائیں گے۔

اے زبان! ہم دیکھتے ہیں کہ گھوڑا جب اپنے آقا کو دیکھ کر محبت کے

جوش میں آتا ہے تو بے اختیار ہنہناتا ہے اور کتا جب پیار کے مارے بے تاب ہو جاتا ہے تو اپنے مالک کے سامنے دُم ہلاتا ہے۔ سبحان اللہ! وہ نام کے جانور اور ان کا ظاہر و باطن یکساں۔ ہم نام کے آدمی اور ہمارے دل میں "نہیں" اور زبان پر "ہاں"

الٰہی! اگر ہم کو رخصت گفتار ہے تو زبان راست گفتار دے۔ اور اگر دل پر تجھ کو اختیار ہے تو زبان پر ہم کو اختیار دے۔ جب تک دنیا میں رہیں سچے کہلائیں اور جب تیرے دربار میں آئیں تو سچے بن کر آئیں۔



اُردو غزل پر ایک نظر

غزل میں جیسا کہ معلوم ہے کوئی خاص مضمون مسلسل بیان نہیں کیا جاتا۔ الاماشاء اللہ بلکہ جُدا جُدا خیالات الگ الگ بیتوں میں ادا کئے جاتے ہیں۔ اس صنف کا زیادہ تر رواج موجودہ حیثیت کے ساتھ اول ایران میں اور کوئی ڈیڑھ سو برس سے ہندوستان میں ہوا ہے۔ اگرچہ غزل کی اصل وضع جیسا کہ لفظ غزل سے پایا جاتا ہے محض عشقیہ مضامین کے لئے ہوئی تھی۔ مگر ایک مدت کے لیے وہ اپنی اصلیت پر قائم نہ رہی۔ ایران میں اکثر اور ہندوستان میں چند شاعر ایسے بھی ہوئے ہیں جنہوں نے غزل میں عشقیہ مضامین کے ساتھ تصوف اور اخلاق و مواعظ کو بھی شامل کر لیا ہے۔

اگرچہ اس لحاظ سے کہ غزل کی حالت فی زمانہ نہایت ابتر ہے وہ محض ایک بے سود اور دور از کار صنف معلوم ہوتی ہے۔ لیکن چوں کہ شاعر کو مبسوط اور طولانی مسلسل نظمیں لکھنے کا ہمیشہ موقع نہیں مل سکتا اور اس کی قوت متخیلہ بیکار نہیں رہ سکتی، اس لئے بسیط خیالات جو وقتاً بعد وقت شاعر کے ذہن میں فی الواقع گزرتے ہیں یا تو وہ کیفیات جن سے اس کا دل روز مرہ کسی واقعہ کو سُن کر یا کسی حالت کو دیکھ کر سچ مچ متکیف ہوتا ہے، ان کے اظہار کا کوئی آلہ غزل یا رباعی یا قطعہ سے بہتر نہیں ہو سکتا یعض خیالات جو دو مصرعوں میں بالکل زیادہ خوبی کے ساتھ ادا نہیں ہو سکتے ان کو قطعہ یا

رباعی کے لباس میں ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ اور چند بسیط خیالات جو ایک دوسرے سے کچھ تعلق نہیں رکھتے۔ وہ غزل کے سلسلے میں بشرطیکہ ردیف اور قافیہ کی ناقابل برداشت قیدیں کسی قدر ہلکی کردی جائیں منسلک ہوسکتے ہیں۔ ردیف وقافیہ کی بابت اگر وقت نے مساعدت کی تو ہم پھر کسی موقع پر اپنی رائے ظاہر کریں گے۔ یہاں نفس غزل کے متعلق چند باتیں بیان کرتے ہیں۔

غزل کی اصلاح تمام اصناف سخن میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ قوم کے لکھے پڑھے اور ان پڑھ سب غزل سے مانوس ہیں بچے۔ جوان اور بوڑھے سب تھوڑا بہت اس کا چٹخارہ رکھتے ہیں، وہ بیاہ شادی کی محفلوں میں، وجد و سماع کی مجلسوں میں لہو ولعب کی صحبتوں میں، تکیوں میں اور رمنوں میں برابر گائی جاتی ہے، اس کے اشعار ہر موقع اور ہر محل پر بطور سند یا تائید کلام کے پڑھے جاتے ہیں، جو لوگ کتاب کے مطالعہ سے گھبراتے ہیں اور نثر یا نظم میں لمبے چوڑے مضمون پڑھنے کا دماغ نہیں رکھتے وہ بھی غزلوں کے دیوان شوق سے پڑھتے ہیں۔ جس آسانی سے غزل کے اشعار ہر شخص کو یاد ہوسکتے ہیں کوئی کلام یاد نہیں ہوسکتا کیوں کہ اس میں ہر مضمون دو مصرعوں پر ختم اور سلسلہ بیان منقطع ہو جاتا ہے ظاہر ہے کہ جو صنف قوم میں اس قدر دائر و سائر اور مرغوب خاص و عام ہو اس کا اثر قومی مذاق اور قومی اخلاق پر جس قدر ہو تھوڑا ہے اس لیئے ہمارے نزدیک شعرا کو سب سے پہلے غزل کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا

چاہیئے۔ لیکن غزل کی اصلاح جس قدر ضروری ہے اسی قدر دشوار بھی ہے۔ غزل میں جو عام دل فریبی ہے اصلاح کے بعد اس کا قائم رہنا نہایت مشکل ہے۔ جو کان ٹپے ٹھمری سے مانوس ہو جاتے ہیں وہ دھرپت اور خیال سے لذت نہیں اٹھا سکتے۔ داستان سننے والوں کی پیاس تاریخی واقعات سے ہرگز نہیں بجھ سکتی، بوالہوسی اور کام جوئی کی باتوں میں جو مزہ ہے وہ خالص عشق و محبت میں ہر شخص کو حاصل نہیں ہو سکتا، اوباش واوباط کی بولی ٹھولیوں میں جو چٹخارہ ہے وہ سنجیدہ باتوں میں کسی بے حس ہی کو محسوس ہو سکتا ہے جن مذاقوں پر ہزل و مطائبہ کا رنگ چڑھ جاتا ہے ان پر حکمت اور اخلاق کا منتر کارگر نہیں ہوتا، جو لوگ، سرمہ، کاجل، کنگھی چوٹی پر فریفتہ ہیں وہ حسن ذاتی کی حقیقت تک کیوں کر پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن زمانہ بآواز بلند کہہ رہا ہے کہ یا عمارت کی ترمیم ہو گی یا عمارت خود نہ ہو گی۔

غزل کو جن لوگوں نے چمکایا اور مقبول خاص و عام بنایا ہے یہ وہ لوگ تھے جو آج تک اہل اللہ اور صاحب باطن یا کم سے کم عشق الٰہی کا راگ گانے والے سمجھے جاتے ہیں جیسے سعدی۔ رومی۔ خسرو۔ حافظ۔ عراقی۔ مغربی۔ احمد جام اور جامی وغیرہم۔ ان بزرگوں سے پہلے غزل کی طرف زیادہ اعتنا نہیں پایا جاتا، ہم نے حیات سعدی میں کسی موقع پر بیان کیا ہے کہ ان کی غزل کا موضوع جیسا کہ ظاہر الفاظ سے مفہوم ہوتا ہے عشق مجازی نہ تھا بلکہ وہ حقیقت کو مجاز کے پردے میں ظاہر کرتے یا یوں کہو کہ چھپاتے تھے، ان کے ایک ایک لفظ سے پایا جاتا ہے کہ وہ عشق و محبت کے رنگ میں شرابور

تھے، ان کے کلام میں ضرور کوئی ایسی چیز ہے جس کو روحانیت کے ساتھ تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ ان کی غزل سُن کر دنیا کی بے ثباتی اور بے اعتباری کا سماں دل پر چھا جاتا ہے، وہ خال و خط کا ذکر اس طرح کرتے ہیں جس سے شاہد پرستی کی ترغیب نہیں بلکہ دنیا پرستی سے نفرت ہوتی ہے۔ وہ شراب کی بدمستی کو دنیا اور مکاروں کی ہوشیاری سے بہتر بتاتے ہیں، وہ رندی، بدنامی و رسوائی کو صوفیوں کی دلق اور زاہدوں کی زاہد ریائی پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ کوئی گناہ مکر و ریا سے، کوئی حماقت غرورِ مال و جاہ سے کوئی شرک خود پرستی سے اور کوئی دھوکا دنیا سے بڑھ کر نہیں بتاتے۔ ان کا کوئی کلام اثر سے خالی نہیں اور اس سے ظاہر ہے کہ انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ ان کے دل سے نکلا ہے۔

ان لوگوں کی غزل گو بعض حیثیتوں سے قوم کی موجودہ حالت کے مناسب نہ ہو لیکن وہ اس حالت کے بالکل مناسب تھی، جب کہ قوم نے دنیا کو یا دنیا نے قوم کو شکار کر رکھا تھا۔ ان کے اشعار ان لوگوں کے حق میں تازیانے کا حکم رکھتے تھے، جو حبِ دنیا اور حبِ جاہ میں منہمک، خدا سے غافل اور بادۂ نخوت میں مدہوش تھے۔ ان سے ظالم، طماع، حریص اور بخیل عبرت حاصل کرتے تھے۔ وہ ریاکار زاہدوں، واعظوں اور صوفیوں کی قلعی کھولتے تھے۔ وہ سادہ لوح امیروں کو عیار فقیروں کے دام تزویر سے بچاتے تھے، وہ اہل اللہ اور اربابِ صدق و صفا کو نفسِ امارہ کی چوریوں اور خیانتوں سے آگاہ اور متنبہ کرتے تھے۔

اردو میں عام طور پر یہ رنگ تو ایک آدھ کے سوا کسی کی غزل میں کبھی پیدا

نہیں ہوا لیکن عاشقانہ خیالات، نیچرل اور سادہ طور پر ادا کرنے والے اردو غزل گویوں کے ہر طبقے میں کم و بیش ہوتے رہے ہیں مگر افسوس ہے کہ اب یہ رنگ بھی روز بروز مٹتا جاتا ہے۔ الفاظ میں صنعت اور خیالات میں رکاکت و سخافت یوماً فیوماً بڑھتی جاتی ہے۔ ہم بجائے اس کے کہ غزل گوئی کے موجودہ طریقے پر نکتہ چینی کریں یہ زیادہ مناسب سمجھتے ہیں کہ عام طور پر اس کی اصلاح کے متعلق اہل وطن کی خدمت میں چند مشورے پیش کریں۔

۱۔ غزل کے لئے یہ ایک ضروری سی بات قرار پا گئی ہے کہ اس کی بنا عشقیہ مضامین پر رکھی جائے اور حق یہ ہے کہ اگر غزل میں عشق و محبت کی چاشنی نہ دی جائے تو حالت موجودہ میں اس کا سرسبز اور مقبول ہونا ایسا ہی مشکل ہے جیسا کہ شراب میں سرکہ بن جانے کے بعد سرور قائم رہنا لیکن اصل اور نقل میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ جو کیفیت عشق میں ہے وہ تعشق میں ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی۔ جو غزلیں محض تقلیداً عاشقانہ لکھی جاتی ہیں ان میں اتنا ہی اثر ہو سکتا ہے جتنا کہ ایک بھانڈ کی نقل میں جو مجنوں یا فرہاد بن کر مجلس میں آئے۔ اثر قائل اور سامعین کی حالت کا تابع ہے۔ اگر قائل اور سامع میں یا کم سے کم صرف قائل کے دل میں فی الواقع کوئی کیفیت موجود ہے تو اس کیفیت کا بیان ضرور موثر ہوگا۔ جو شخص فی الواقع مظلوم یا مصیبت زدہ ہے جب وہ اپنی سرگذشت بیان کرے گا ضرور اس کے بیان سے لوگوں کے دلوں پر چوٹ لگے گی لیکن اگر یہی بیان کسی ایسے شخص کی زبان سے سرزد ہوگا جس کی حالت خود اس کی تکذیب کرتی ہے تو اس سے سوائے اس کے کہ

لوگوں کو ہنسی آئے اور کوئی اثر مترتب نہیں ہو سکتا، پس ایک پارسا نوجوان جس کو ہوا و ہوس کی کبھی ہوا تک نہیں لگی، یا ایک ستر برس کا پیر مرد جس میں بوالہوسی کی قابلیت نہیں رہی ان کو ہرگز زیبا نہیں معلوم ہوتا کہ غزل میں شاہد بازی اور ہوا پرستی کے مضمون باندھ کر پہلا اپنے اوپر بہتان باندھے اور دوسرا اپنے تئیں رسوا اور بدنام کرے۔

محبت کچھ ہوا و ہوس اور شاہد بازی و کام جوئی پر موقوف نہیں ہے بندے کو خدا کے ساتھ، اولاد کو ماں باپ کے ساتھ، خاوند کو بیوی کے ساتھ، بیوی کو خاوند کے ساتھ، نوکر کو آقا کے ساتھ، رعیت کو بادشاہ کے ساتھ دوستوں کو دوستوں کے ساتھ، آدمی کو جانور کے ساتھ، مکین کو مکان کے ساتھ، وطن کے ساتھ، ملک کے ساتھ، قوم کے ساتھ، خاندان کے ساتھ غرض کہ ہر چیز کے ساتھ لگاؤ اور دلبستگی ہو سکتی ہے۔ پس جب کہ عشق و محبت میں اس قدر احاطہ اور جامعیت ہے اور جب کہ عشق کا اعلان کم ظرفی اور معشوق کا پتہ بتانا بے غیرتی ہے تو کیا ضرور ہے کہ عشق کو محض ہوائے نفسانی اور خواہش حیوانی میں محدود کر دیا جائے اور ایسے سرِ مکتوم کو فاش کر کے اپنی تنگ ظرفی اور بے حوصلگی ظاہر کی جائے۔

اسی لئے ہماری یہ رائے ہے کہ غزل میں جو عشقیہ مضامین باندھے جائیں وہ ایسے جامع الفاظ میں ادا کئے جائیں جو دوستی اور محبت کی تمام انواع و اقسام اور تمام جسمانی اور روحانی تعلقات پر حاوی ہوں، اور جہاں تک ہو سکے کوئی لفظ ایسا نہ آنے پائے جس سے کھلم کھلا

مطلوب کا مرد یا عورت ہونا پایا جائے۔ مثلاً کلاہ، چہرہ، دستار، جامہ، قبا، سبزہ خط، مسیں بھیگنا۔ زرگر پسر، مطرب پسر، مغبچہ، ترسا بچہ وغیرہ وغیرہ یا محرم، کرتی، مہندی، چوڑیاں، چوٹی، موباف، آرسی، جھومر وغیرہ۔

اگرچہ جیسا کہ حیات سعدی کے خاتمے میں ہم نے مفصل بیان کیا ہے، مرد کا مطلوب مرد کو قرار دینا جو ایران اور ہندوستان کی شاعری میں مروج ہے یہ محض ایک غلط فہمی اور قومی حمیت کے خیال پر مبنی ہے، نہ کہ حقائق اور واقعات پر لیکن پھر بھی یہ ایک ایسا قبیح اور نالائق دستور ہے جو قومی اخلاق کو داغ لگاتا ہے، لہٰذا اس کو جہاں تک ممکن ہو ترک کرنا چاہیئے اور اس بات کا خیال بالکل چھوڑ دینا چاہیئے کہ ایران اور ہندوستان کے تمام شعرائے نامور اسی طریقے پر غزل کہتے چلے آئے ہیں ہر زمانے کا اقتضا الگ ہوتا ہے، جو فحش اور بے حیائی کی باتیں ایران اور ہندوستان کے بڑے بڑے پیراموں کے کلام میں موجود ہیں، اگر ہم آج ویسی باتوں میں ان کی تقلید کریں تو قانوناً مجرم ٹھہرتے ہیں پس جہاں ہم نے ان کی بہت سی خرافات مواخذہ عدالت کے خوف سے چھوڑی ہیں ان کی ایک آدھ خرافت محض عقل اور اخلاق کے حکم سے بھی چھوڑنی چاہیئے۔

اسی طرح غزل میں ایسے الفاظ استعمال کرنے جو عورتوں کے لوازمات اور خصوصیات پر دلالت کریں اس قوم کی حالت کے بالکل نامناسب ہیں، جو پردے کے قاعدے کی پابند ہو۔ کیونکہ اگر معشوقہ کوئی منکوحہ یا مخطوبہ ہے تو اس کے حسن و جمال کی تعریف کرنی اور اس کے کرشمہ ناز و انداز کی تصویر کھینچنی گویا اپنے ننگ و ناموس کو اپنوں اور پرایوں سے انٹروڈیوس کرانا ہے

اور اگر کوئی بازاری بیسوا ہے تو اپنی نالائقی اور بدنیتی کا ڈھنڈورا پیٹنا ہے، اسی بنا پر ایران میں جتنے ممتاز اور برگزیدہ اور اعلیٰ درجے کے غزل گو گزرے ہیں ان کی غزل میں عورتوں کی خصوصیات اس قدر کم پائی جاتی ہیں کہ گویا بالکل نہیں ہیں، اور اتنی بات اب تک ہندوستان میں موجود ہے کہ گو غزل میں مطلوب کبھی مرد کو اور کبھی عورت کو قرار دیتے ہیں اور کبھی مرد کی اور کبھی عورت کی خصوصیات بھی ذکر کرتے ہیں لیکن کبھی مطلوب کے لیے افعال یا صفات مونث نہیں لاتے۔ بلکہ ہمیشہ مذکر لاتے ہیں، مثلاً یوں کبھی نہیں کہتے کہ وہ روزن دیوار سے جھانکتی تھی یا وہ پری ہمارا دل لے گئی یا وہ آرسی میں منہ دیکھتی تھی، یا وہ بالے پہن رہی تھی، یا وہ اپنی صورت کی متوالی ہے یا وہ عاشق کا دل جلانے والی ہے، بلکہ ایسی حالتوں میں بھی افعال وصفات ہمیشہ مذکر ہی لاتے ہیں حالانکہ مقام تانیث کا مقتضی ہوتا ہے، مثلاً ذوق کہتے ہیں ؎

جھانکتے تھے وہ ہمیں جس روزن دیوار سے
وائے قسمت ہو اسی روزن میں گھر زنبور کا

یا آمانت لکھنوی کہتے ہیں ؎

شاعروں میں وہ پری زلف کو واکیا کرتا
مو شگافوں کو گرفتار بلا کیا کرتا

غرض کہ کسی اردو غزل گو نے معشوق کے لیے جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے فعل یا صفت مؤنث استعمال نہیں کی۔

اگر معشوق کو اطلاق کی حالت میں چھوڑ دیا جائے اور کوئی خصوصیت رجال یا نسا کی غزل میں ذکر نہ کی جائے، تو اس صورت میں افعال و صفات کا مذکر لانا بالکل قاعدے کے موافق ہوگا۔ تمام دنیا کی زبانوں میں یہ قاعدہ عام معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی حکم مطلق انسان کی نسبت لگایا جاتا ہے اور مرد یا عورت کی تخصیص مقصود نہیں ہوتی تو گو نوع انسان میں ذکور و اناث دونوں داخل ہیں مگر اس حکم کا موضوع ہمیشہ فرد کامل یعنی مذکر قرار دیا جاتا ہے نہ کہ مونث، مذہب میں، فلسفہ میں، طب میں، اخلاق میں اور تمام علوم میں۔ یہی قاعدہ عموماً جاری ہے، لیکن معشوق کو کبھی چہرہ یا قبا یا سبزۂ خط کے ساتھ اور کبھی چوٹی، موباف، آرسی اور چوڑیوں کے ساتھ ذکر کرنا اور باوجود اس کے افعال و صفات کو ہمیشہ مذکر لانا اس کے یہ معنی ہوں گے کہ معشوق نہ مرد ہے اور نہ عورت بلکہ زنانہ ہے یا ہیجڑا۔

ایسے اشعار جن میں عشق کا بیان ایسے لفظوں میں کیا گیا ہو جو محبت کے عام مفہوم پر حاوی ہوں یا جو محض روحانی یا عشق الٰہی پر محمول ہو سکیں اور جن سے مطلوب کا مرد یا عورت ہونا مطلقاً نہ پایا جائے، کیا فارسی اور کیا اردو دونوں کی غزل میں بکثرت موجود ہیں۔ خصوصاً شعرائے متصوفین کے کلام میں زیادہ تر اسی قبیل کے اشعار پائے جاتے ہیں، پس غزل میں ہمیشہ کے لئے ایسا التزام کرنے کی خواہش کرنی کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کو تکلیف مالا یطاق سمجھا جائے۔

۲۔ جس طرح عشقیہ مضامین غزل کے نیچر میں داخل ہیں اسی طرح

خمریات یعنی شراب اور اس کے لوازمات کا ذکر اور نیز فقہا و زہاد اور تمام اہل ظاہر پر طعن و تعریض کرنی اپنی مے خواری و توبہ شکنی و خرابات نشینی پر فخر کرنا اور اہل شرع اور اہل تقویٰ کے اعمال و اقوال میں عیب نکالنے اور اسی قسم کی اور باتیں جو عقل و شرع کے خلاف ہوں یہ مضامین بھی غزل کے اجزائے غیر منفک قرار پا گئے ہیں۔ سب سے پہلے غزل میں یہ طریقہ شعرائے متصوفین نے جو اہل اللہ اور صاحب باطن سمجھے جاتے ہیں اختیار کیا تھا جیسے سعدی و رومی و حافظ و خسرو وغیرہم چوں کہ ان لوگوں کی غزل نے ایران اور ہندوستان میں زیادہ رواج اور حسن قبول پایا اور خاص کر خواجہ حافظ کی غزل جس میں ان مضامین کی بہتات سب سے بڑھ کر ہے حد سے زیادہ مقبول و مشہور ہوئی ہے' اس لیے متاخرین نے بھی ان کی تقلید سے یہی شیوہ اختیار کر لیا۔ مگر ہم کو دیکھنا چاہیے کہ ان بزرگوں نے جو ایسے مضامین باندھنے میں اس قدر غلو کیا ہے اس کا منشا کیا تھا۔ فقہا اور اہل ظاہر ہمیشہ دو فرقوں کے سخت مخالف رہے ہیں۔ ایک اہل باطن کے دوسرے اہل رائے کے فقہا کے فتووں سے ان دونوں گروہوں کو ہمیشہ سخت نقصان پہنچتے رہے ہیں۔ قتل کیے گئے ہیں' دار پر چڑھائے گئے ہیں' مشکیں بندھی ہیں' کوڑے کھائے ہیں' قیدیں بھگتی ہیں' جلاوطن کیے گئے ہیں' کتابیں جلائی گئی ہیں اور کیا کیا کچھ ہوا ہے۔ جب کہ فقہا کی مخالفت کا ان لوگوں کے ساتھ یہ حال تھا تو یہ بھی اپنی تصنیفات میں نثر ہو یا نظم خوب دل کے بخارات نکالتے تھے' بقول شخصے "کسی کا ہاتھ چلے کسی کی زبان" فقہا و واعظین ان کے اقوال و افعال پر

گرفت کرتے تھے، انھوں نے ان کے اخلاق کی قلعی کھولنی شروع کی، وہ کہتے تھے کہ یہ لوگ خلاف شرع کام کرتے ہیں، انھوں نے کہا شراب خواری و قمار بازی جو اکبر الکبائر ہیں وہ بھی جو فروشی و گندم نمائی سے بہتر ہیں، وہ کہتے تھے کہ یہ لوگ خلاف شرع باتیں کہتے ہیں، انھوں نے کہا علانیہ کفر بکنا اس سے بہتر ہے کہ دل میں کفر ہو اور زبان پر اسلام وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے تھے، انھوں نے کہا کہ اوروں کو ہدایت کرتے اور آپ گم راہ رہنے سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں، وہ کہتے تھے کہ تم لوگ حقوق الٰہی ادا نہیں کرتے، انھوں نے کہا تم حقوق عباد میں خیانت کرتے ہو۔ الغرض شعرائے متصوفین نے جو اہل ظاہر پر خردہ گیریاں کی ہیں وہ اسی قسم کی تعریضات اور مطارحات ہیں۔

اس کے سوا ان لوگوں کی غزل میں اکثر شراب و ساقی و جام و صراحی اور ان کے لوازمات اور خلاف شرع الفاظ مجازاً اور استعارے کے طور پر استعمال ہوئے ہیں یہ لوگ (یا تو اس خیال سے کہ دوست کا راز اغیار پر ظاہر نہ ہو یا اس نظر سے کہ لوگوں کا حسن ظن جو رہ زن طریقت ہے، اس سے محفوظ رہیں، یا اس لئے کہ عشق و محبت کی بھڑاس آزادانہ اور رندانہ گفتگو میں بہ نسبت سنجیدہ اور مئودب گفتگو کے خوب نکلتی ہے اور یا اس غرض سے کہ حریفوں کو چھیڑ چھیڑ کر اور زیادہ بھڑکائیں اور ان کی زجر و ملامت جو بے گناہ ملزموں کو تحسین و آفرین سے زیادہ خوش گوار ہوتی ہے مزے لے لے کر سنیں) روحانی کیفیات کو شراب و شاہد کے پیرایہ میں بیان کرتے تھے، سب سے آخر درجے کا ثبوت مولانا روم کی اس رباعی سے ہوتا ہے :-

دی بر سر کوئے زلہ غارت کردم
مرپاکاں را جذب زیارت کردم
شکر اللہ آں کہ روزہ خوردم رمضاں
در عید نماز بے طہارت کردم

شاہ ولی اللہ صاحب نے اس رباعی کی شرح لکھی ہے وہ کہتے ہیں کہ رمضان میں روزہ کھانے کے یہ معنی ہیں کہ جب مجاہدے سے مشاہدے تک نوبت پہنچ گئی تو ریاضت ترک کر دی گئی اور نماز بے طہارت سے یہ مراد ہے کہ جب وصل کی عید میسر آ گئی اور جدائی کا الم جاتا رہا، اب حضوری بے کیف جو کہ حقیقت صلوٰۃ ہے ہر وقت رہنے لگی یہاں تک کہ ظاہری طہارت اور عدم طہارت اور جاگتے سوتے غرض کہ ہر حالت میں دولت حضوری موجود ہے، خواجہ حافظ کا یہ شعر بھی اسی قبیل کا ہے ؎

پیر ما گفت خطا در قلم صنع نہ رفت
آفریں در نظر پاک خطا پوشش باد

دوسرے مصرعہ میں خطا پوش کے لفظ سے قلم صنع کی خطا پوشی کا خیال ذہن میں گزرتا ہے مگر فی الحقیقت یہ مطلب نہیں ہے بلکہ انسان کی عیب پوشی مقصود ہے، کیوں کہ قلم صنع میں کبھی خطا نہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ جو کچھ اس نے لکھ دیا ہے وہ امٹ ہے اور اس سے انسان کا مجبور ہونا اور اس لئے اس کا بے خطا ہونا ثابت ہوتا ہے۔

مذکورۂ بالا اشعار سے صاف پایا جاتا ہے کہ یہ بزرگوار قصداً ایسے الفاظ برتتے تھے جن سے اہل ظاہر کو نکتہ گیری کرنے کا موقع ملے اس لئے مولانا روم فرماتے ہیں ؎

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

ان بزرگوں کے سوا بعض شعرا ایسے بھی گزرے ہیں جو فی الواقع شراب پینے کے عادی تھے اور نشہ یا خمار کی حالت میں جو کیفیت ان کے دل پر گزرتی تھی یا جو اثر ان کی طبیعت یا اخلاق پر ہوتا تھا، اس کو شعر میں بیان کرتے تھے۔

چوں کہ شاعری کا جزو اعظم (جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے) یہ ہے کہ اس میں جو خیال باندھا جائے اس کی بنیاد اصلیت پر ہونی چاہیے، اس لیے اصول شاعری کے موافق شراب و کباب کے مضمون باندھنا صرف ان لوگوں کا حق ہونا چاہیے جو یا تو خود اس میدان کے مرد ہوں اور یا اپنے اصلی خیالات خمریات کے پیرائے میں بطور مجاز و استعارہ کے ادا کر سکتے ہوں، ورنہ وہ قدما کے ایسے ہی مقلد سمجھے جائیں گے، جیسا بندر انسان کا ہوتا ہے۔ نیز واعظ و زاہد وغیرہ کو لتاڑنا اور ان پر نکتہ چینی کرنی انھیں لوگوں کو زیبا ہے جن کو فی الواقع ان کے ساتھ کوئی وجہ مخالفت کی ہو۔ ہاں باوجود نہ کسی قسم کی مخالفت کے صرف ایک صورت سے واجبی طور پر ایسے مضامین باندھے جا سکتے ہیں یعنی نکتہ چینی ایسے طریقے سے کی جائے جس سے معلوم ہو کہ محض ریا و مکر و سالوس کی برائی بیان کرنی مقصود ہے نہ کہ زہاد اور واعظین کی ذات پر حملہ کرنا، کیوں کہ رذائل کی برائی اور فضائل کی خوبی بغیر اس کے دل نشیں نہیں کی جا سکتی کہ کسی شخص یا گروہ کو ان کا موضوع فرض کر لیا جائے اور معقولات کو محسوسات کے پیرائے میں ظاہر کیا جائے ظلم اور عدل کا بیان واضح طور پر اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ظالم یا منصف بادشاہ کی مذمّت یا تعریف کی جائے اور نامردی یا بہادری کی تصویریں یوں ہی دکھائی جا سکتی ہے کہ ان کو کسی بزدل

یا بہادر کے قالب میں ڈھالا جائے، لیکن اس صورت میں ضرور ہے کہ واعظ اور زاہد وغیرہ کی کسی ایسی صفت کی طرف جو عقلاً یا شرعاً قابل الزام ہو، کچھ اشارہ کیا جائے ورنہ کہا جائے گا کہ نیکوں پر نہ اس لئے کہ وہ قابلِ الزام ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ نیک ہیں حملہ کیا جاتا ہے، یہاں بطور مثال کے ہم شیخ ابراہیم ذوق کے دو شعر لکھتے ہیں۔

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو | تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

اس شعر میں کسی قدر اس خصلت کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے جو زاہدوں اور عابدوں میں ہوتی ہے کہ اوروں کو ذرا ذرا سے قصور پر ملامت کرتے ہیں اور اپنے ظاہری احکام کی پابندی پر مغرور ہو کر باطن کی اصلاح سے غافل رہتے ہیں، لہٰذا اس طرزِ بیان پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا، مگر دوسری جگہ وہ اس طرح فرماتے ہیں ؎

ذوق زیبا ہے جو ہو ریش سفید شیخ پر | وسمہ آب بنگ سے مہندی مے گل رنگ سے

اس شعر میں شیخ کا کوئی گناہ یا قصور سوا اس کے کہ شیخ شیخ ہے نہیں جتلایا گیا، کہ ایک مقدس آدمی پر دو پھبتیاں کہہ کر بھنگڑوں اور شرابیوں کی خباثت طبع کی جائے۔ ایسے اشعار ہمارے شعرا کے کلام میں بکثرت پائے جاتے ہیں اور ایسے شعروں کو اگر ہم اپنے شعرا کا حد سے زیادہ ادب کریں تو سعدی اور سوزنی کی ہزلیات سے زیادہ وقعت نہیں دے سکتے۔

۳۔ مذکورۂ بالا مضامین کے سوا اور جس بات کا سچا جوش اور ولولہ دل میں اٹھے خواہ اس کا منشا خوشی ہو یا غم، یا حسرت یا ندامت یا شکر یا شکایت

یا صبر یا قناعت - یا توکل - یا رغبت - یا نفرت - یا رحم - یا انصاف - یا غصہ یا تعجب - یا امید - یا ناامیدی - یا شوق - یا انتظار - یا حب وطن - یا قومی ہمدردی - یا رجوع الی اللہ - یا حمایت دین و مذہب - یا دنیا کی بے ثباتی اور موت کا خیال - یا اور کوئی جذبہ جذبات انسانی میں سے اس کو بھی غزل میں بیان کر سکتے ہیں۔

اگرچہ اصل وضع کے لحاظ سے غزل کا موضوع عشق و محبت کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہے لیکن ہمارے شعرا نے اس کو ہر مضمون کے لئے عام کر دیا ہے اور اب اس صنف کو محض مجازاً غزل کہا جاتا ہے۔ پس ہر قسم کے خیالات جو شاعر کے دل میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوں وہ غزل یا رباعی یا قطعہ میں بیان ہو سکتے ہیں، مگر یہ صحیح نہیں ہے کہ جو خیالات اگلوں نے زمانے کے اقتضا سے یا اپنے جذبات کے جوش میں ظاہر کئے ہیں ہم بھی وہی راگ گاتے رہیں اور انھیں کے خیالات کا اعادہ کرتے رہیں نہیں بلکہ ہم کو چاہیے کہ اپنی غزل کو خود اپنے خیالات اور اپنے جذبات کا آرگن بنائیں۔ ممکن ہے کہ اگلوں میں سے کسی نے دنیا کے لئے ہاتھ پانوں مارنے اور کوشش کرنے کو عبث اور فضول بتلایا ہو، لیکن ہمارے دل میں اس خیال کی حقارت ہو یا انہوں نے اس کے برعکس ہاتھ پانوں توڑ کر بیٹھنے کو نامردی اور بے غیرتی کی بات سمجھا ہو لیکن ہم میں سے کسی کے دل پر اس کے برخلاف حالت طاری ہو، دونوں صورتوں میں ہمارے منہ سے وہی صدا نکلنی چاہیے جو ہمارے دل سے اٹھی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خود ہیں پر ایک وقت ایسا گذرے کہ مثلاً کوشش و تدبیر ہم کو

محض بے سود و لاحاصل معلوم ہو اور دوسرے وقت ہمارے ہی دل میں ایسا جوش پیدا ہو کہ پہاڑ کو جگہ سے ہٹا دینے کا ارادہ کریں۔ ہم کو دونوں حالتوں کی تصویر اپنے اپنے موقع پر بے کم و کاست کھینچ دینی چاہئے اس سے نہ صرف فطرت انسانی کے دقائق و غوامض اور جو انقلاب کہ اس کی طبیعت میں آناً فاناً پیدا ہوتے ہیں ہی منکشف ہوں گے، بلکہ قومی اخلاق پر بھی عمدہ اثر ہو گا۔ کیونکہ جب تک ہر چیز کا اچھا اور برا دونوں پہلو نہ دکھائے جائیں تب تک اعتدال کی خوبی جلوہ گر نہیں ہوتی۔ مثلاً صائب ایک جگہ کہتے ہیں ؎

قناعت کن بہ نانِ خشک تا بے آرزو گردی
کہ خواہش ہائے الوان ہست نعمت ہائے الواں را

دوسری جگہ یہی صائب کہتے ہیں ؎

صرف بیکاری مگرداں روزگار خویش را
پردۂ روئے توکل ساز کار خویش را

ظاہر ہے کہ جب تک دونوں مختلف خیال ملحوظ نہ رکھے جائیں تب تک قناعت کا وہ درجہ جو تن آسانی اور حرص کے بیچوں بیچ واقع ہے حاصل نہیں ہو سکتا۔

شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ اخلاقی مضامین سے غزل میں وہ گرمی پیدا نہیں ہو سکتی جو عشقیہ مضامین میں ہوتی ہے۔ جو اثر شوق و آرزو اور دردِ جدائی اور کاہشِ انتظار اور رشکِ اغیار کے بیان میں ہے وہ واعظانہ پند و نصیحت میں ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بے شک اخلاقی مضامین کو مؤثر پیرائے میں بیان کرنا نہایت مشکل کام ہے اور بلاشبہ غزل جس میں سوز و گداز نہ ہو اور یہ جو چلبلا اور چونچال نہ ہو دونوں میں کچھ کشش اور گیرائی نہیں ہوتی، لیکن ہمارے معاصرین کے لئے سوز و گداز کا اس قدر مصالحہ موجود ہے جو صدیوں تک ختم نہیں سکتا۔

دنیا میں ایک انقلاب عظیم ہو رہا ہے اور ہوتا چلا جاتا ہے۔ آج کل دنیا کا حال صاف اس درخت کا سا نظر آتا ہے جس میں برابر نئی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں اور پرانی ٹہنیاں جھڑتی چلی جاتی ہیں، تناور درخت زمین کی تمام طاقت چوس رہے ہیں اور چھوٹے چھوٹے تمام پودے جو ان کے گرد و پیش ہیں سوکھتے چلے جاتے ہیں، پرانی قومیں جگہ خالی کرتی جاتی ہیں اور نئی قومیں ان کی جگہ لیتی جاتی ہیں اور یہ کوئی گنگا جمنا کی طغیانی نہیں ہے جو آس پاس کے دیہات کو دریا برد کر کے رہ جائے گی بلکہ یہ سمندر کی طغیانی ہے جس سے تمام کرۂ زمین پر پانی پھرتا نظر آتا ہے کہ اگر کوئی دیکھے اور سمجھے تو صدہا تماشے صبح سے شام تک ایسے عبرت خیز نظارے آتے ہیں کہ شاعر کی تمام عمر اس کی جذبات کے بیان کرنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔ کسی واقعہ کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ یہ کیا ہوا، کسی کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ یہ کیوں ہوا، کبھی خوف معلوم ہوتا ہے کہ کیا ہوگا اور کبھی یاس دل پر چھا جاتی ہے کہ بس اب کچھ نہیں۔ اس سے زیادہ دل حسب مطلب غزل کے لئے اور کیا ہو سکتا ہے۔ ہر بات کا ایک محل اور ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔ عشق و عاشقی کی ترنگیں اقبال مندی کے زمانے میں زیبا تھیں۔ اب وہ وقت گیا، عیش و عشرت کی رات گزر گئی اور صبح نمودار ہوئی، اب کانگڑے اور سہاگ کا وقت نہیں رہا، اب جوگئے کی الاپ کا وقت ہے۔

اس کے سوا بڑے بڑے استادوں نے اکثر مسلسل غزلیں بھی لکھی ہیں جن میں ایک شعر کا مضمون دوسرے شعر سے الگ نہیں ہے بلکہ ساری ساری غزل کا مضمون اول سے آخر تک ایک ہے۔ ایسی غزلیں اگر کوئی لکھنی چاہے تو

ان میں کسی قدر طولانی مضمون بھی بندھ سکتے ہیں مثلاً ہر ایک موسم کی کیفیت صبح اور شام کا سماں، چاندنی رات کا لطف، جنگل یا باغ کی بہار، میلے تماشوں کی چہل پہل، قبرستان کا سناٹا، سفر کی روئداد، وطن کی دل بستگی اور اسی قسم کی اور بہت سی باتیں مسلسل غزل میں بہت خوبی سے بیان ہو سکتی ہیں۔

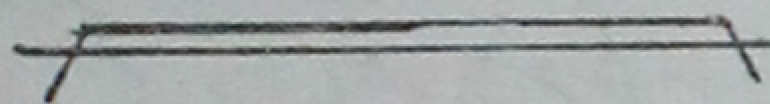
الغرض غزل کو باعتبار مضامین اور خیالات کے جہاں تک ممکن ہو وسعت دینی چاہیے۔ شعر کی لوگوں کو اتنی ضرورت نہیں ہے جیسی کہ بھوک میں کھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان کو اگر ہمیشہ طرح بہ طرح کے کھانے میسر نہ آئیں، تو وہ تمام عمر ایک ہی کھانے پر قناعت کر سکتا ہے۔ لیکن شعر یا راگ میں جب تلون اور تنوع نہ ہو، ان سے جی اکتا جاتا ہے۔ جوگیا صبح و شام، رات اور دن بھیرویں الاپے جائے اس کا گانا اجیرن ہو جاتا ہے، اسی طرح شعر میں ہمیشہ ایک ہی قسم کے مضامین سنتے سنتے شعر سے نفرت ہو جاتی ہے۔

مکرر گرچہ سحر آمیز باشد طبیعت را ملال انگیز باشد

اگرچہ اس میں شک نہیں کہ جس طرح شعر میں جدت پیدا کرنی اور ہمیشہ نئے اور اچھوتے مضامین پر طبع آزمائی کرنی شاعر کا کمال ہے، اسی طرح ایک مضمون کو مختلف پیرایوں اور متعدد اسلوبوں میں بیان کرنا بھی کمال شاعری میں داخل ہے لیکن جب ایک ہی مضمون ہمیشہ نئی صورت میں دکھایا جاتا ہے تو اس میں تازگی باقی نہیں رہتی۔ ہر مضمون کے چند محدود پہلو ہوتے ہیں، جب وہ تمام پہلو ہو چکتے ہیں تو اس مضمون میں تنوع کی گنجائش نہیں رہتی۔ اب بھی اگر اسی کو چھیڑے چلے جائیں گے تو بجائے تنوع کے تکرار اور اعادہ ہونے لگے گا۔

بہروپیا دو چار روپ بھر کر لوگوں کو شبہ میں ڈال سکتا ہے، مگر پھر اس کی قلعی کھل جاتی ہے۔ ہر کوئی اس کو دور ہی سے دیکھ کر پہچان لیتا ہے، کہ بہروپیا ہے۔ ہم لوگ جب غزل لکھ کر مشاعرے میں جاتے ہیں تو اپنے دل میں سمجھتے ہیں کہ ہم سب سے الگ اور اچھوتے مضمون باندھ کر لے چلے ہیں مگر غزل کو دیکھئے تو وہی انگریزی مٹھائی کا بکس ہے کہ مٹھائیوں کی شکلیں مختلف ہیں لیکن مزا سب کا ایک ہے۔ فرض کرو کہ مختلف شکلوں کے متعدد سانچے تیار ہیں کوئی مدور ہے، کوئی مستطیل، کوئی مربع، کوئی مسدس اور کوئی مثمن اب ہر ایک سانچے میں موم پگھلا کر ڈالو۔

ظاہر ہے کہ ہر سانچے سے موم نئی شکل پر ڈھل کر نکلے گا، بعینہ ایسا ہی حال غزل کا ہے، مضمون وہی معمولی ہیں، مگر بحر اور ردیف و قافیہ کے خلاف سے مختلف شکلیں پیدا کر لیتے ہیں۔



میر انیس کی خصوصیات شاعری

فصاحت

علمائے ادب نے فصاحت کی یہ تعریف کی ہے کہ لفظ میں جو حروف آئیں ان میں تنافر[1] نہ ہو۔ الفاظ نامانوس نہ ہوں۔ قواعد صرفی کے خلاف نہ ہو اس اجمال[2] کی تفصیل یہ ہے کہ لفظ درحقیقت ایک قسم کی آواز ہے۔ اور چونکہ آوازیں بعض شیریں، دل آویز اور لطیف ہوتی ہیں۔ مثلاً طوطی اور بلبل کی آواز اور بعض مکروہ اور ناگوار مثلاً کوے اور گدھے کی آواز اس بنا پر الفاظ بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض شستہ اور سبک و شیریں اور ثقیل اور بھدے ناگوار پہلی قسم کے الفاظ کو فصیح کہتے ہیں اور دوسری کو غیر فصیح بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ فی نفسہ ثقیل و مکروہ نہیں ہوتے لیکن تحریر و تقریر میں ان کا استعمال نہیں ہوا ہے یا بہت کم ہوا ہے۔ اس قسم کے الفاظ بھی جب ابتداءً استعمال کئے جاتے ہیں تو کانوں کو ناگوار معلوم ہوتے ہیں ان کو فن بلاغت کی اصطلاح میں غریب کہتے ہیں اور اس قسم کے الفاظ بھی فصاحت میں خلل انداز خیال کئے جاتے ہیں۔

میر انیس کی کمال شاعری کا بڑا جوہر یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ انھوں نے اردو شعراء میں سے سب سے زیادہ الفاظ استعمال کئے اور سیکڑوں

---

[1] تنافر۔ نفرت کرنا۔ اجنبیت، ایک دوسرے سے الگ [2] گول گول۔ مختصر کہنا۔

مختلف واقعات بیان کرنے کی وجہ سے ہر قسم اور ہر درجہ کے الفاظ ان کو استعمال کرنے پڑے تاہم ان کے تمام کلام میں غیر فصیح الفاظ نہایت کم پائے جاتے ہیں۔ اکثر جگہ عربی فارسی کے الفاظ جو اردو زبان میں کم مستعمل ہیں، ضرورت سے لانے پڑے ہیں۔ لیکن اوس قسم کے الفاظ جہاں آئے ہیں، فارسی ترکیبوں کے ساتھ آئے ہیں جس سے انکی غرابت کم ہو گئی ہے ورنہ اگر اردو کی خاص ترکیب میں ان الفاظ کا استعمال کیا جاتا تو بالکل خلاف فصاحت ہوتا۔ مثلاً انگشتری۔ خاتم، رُخ بادہ، ثنا، حسن اور اس قسم کے سینکڑوں ہزاروں الفاظ ہیں جو بجائے خود فصیح ہیں۔ لیکن ٹھیٹ اُردو میں ان کا استعمال نہیں ہوتا۔ میر ضمیر ایک موقع پر کہتے ہیں ع

"ذرّیتِ رسول کی خاطر جلائی نار"

نار کا لفظ اس موقع پر نہایت نامانوس اور بیگانہ ہے۔ لیکن یہی لفظ جب فارسی ترکیبوں کے ساتھ اردو میں مستعمل ہوتا ہے۔ مثلاً نار دوزخ، نار جہنم۔ تو وہ غرابت نہیں رہتی۔

فصاحت کے مدارج میں اختلاف ہے۔ بعض الفاظ فصیح ہیں، بعض فصیح تر، بعض اس سے بھی فصیح تر۔ میر انیس صاحب کے کلام کا بڑا خاصّہ یہ ہے کہ وہ ہر موقع پر فصیح سے فصیح الفاظ ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔ مرزا دبیر اور میر انیس کے ہم مضمون اشعار لو۔ اگر مرزا صاحب کے یہاں غریب اور ثقیل الفاظ ہوں گے تو ان کے مقابلہ میں میر صاحب کے یہاں فصیح الفاظ ہوں گے اگر مرزا صاحب کے یہاں فصیح الفاظ ہوں گے تو میر صاحب کے یہاں

فصیح تر ہوں گے مرزا دبیر کی تخصیص نہیں تمام مرثیہ گویوں کے مقابلہ میں میر صاحب کے کلام کا یہی حال ہے۔

ہم مثال کے طور پر دو چار شعر نقل کرتے ہیں جن سے فصاحت اور فصاحت کے اختلاف مراتب کا اندازہ ہو سکے گا۔

مرزا دبیر "کس نے نہ دی انگوٹھی رکوع و سجود میں"

میر انیس "سائل کو کس نے دی ہے انگوٹھی نماز میں"

مرزا دبیر "آنکھوں میں پھرے اور نہ مردم کو خبر ہو"

میر انیس "آنکھوں میں یوں پھرے کہ مژہ کو خبر نہ ہو"

مرزا دبیر "رویا ہیں بھی حسین کو رویا ہی کرتے ہیں"

میر انیس "حسرت یہ ہے کہ خواب میں بھی رویا کیجئے"

مرزا دبیر "جیسے مکان سے زلزلہ میں صاحب مکاں"

میر انیس "جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے"

ابتذال

فصاحت کے متعلق ایک بڑا دھوکہ یہ ہوتا ہے کہ چونکہ فصاحت کے یہ معنی ہیں کہ الفاظ سادہ، آسان کثیر الاستعمال ہو، اس لئے لوگ متبذل اور سوقی[1] الفاظ کو بھی فصیح سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ ان دونوں میں سفید و سیاہ کا فرق ہے۔ مرزا دبیر صاحب جہاں واقعہ نگاری اور معاملہ بندی میں میر انیس کی تقلید کرتے ہیں، اکثر ان کے کلام میں متبذل الفاظ آجاتے ہیں مثلاً جہاں

[1] سوقی۔ بازاری۔ عامیانہ۔

حضرت شہربانو نے حضرت عباس کی لاش پر نوحہ کیا ہے۔ حضرت شہربانو کی زبان سے فرماتے ہیں۔ ع

"ہے ہے مرے دیور مرے دیور"

ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔ ع

"ناڑا تو ان کی سالگرہ کا نکال لا"

ابتذال کی صاف اور بین[1] مثال نظیر اکبر آبادی کا کلام ہے اگر یہ مبتذل نہ ہوتا تو سادگی اور صفائی میں نظیر کا کلام میر انیس یا میر تقی سے ٹکر کھاتا۔

ابتذال کے معنی عام طور پر یہ سمجھے جاتے ہیں کہ جو الفاظ عام لوگ استعمال کرتے ہیں۔ وہ مبتذل ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ سیکڑوں الفاظ عوام کے مخصوص الفاظ ہیں۔ لیکن سب میں ابتذال نہیں پایا جاتا۔ ابتذال کا معیار[2] مذاق صحیح کے سوا کوئی چیز نہیں۔ مذاق صحیح خود بتا دیتا ہے کہ یہ الفاظ مبتذل اور لیپٹ اور سوقیانہ ہے۔

میر صاحب کو اگرچہ واقعہ نگاری کی وجہ سے نہایت چھوٹی چھوٹی چیزوں اور ہر قسم کے جزئی واقعات اور حالات کو بیان کرنا پڑتا ہے لیکن یہ ان کی انتہائی درجہ کی قادر الکلامی ہے کہ پھر بھی ان کی شاعری کے دامن پر ابتذال کا دھبہ نہیں آنے پاتا۔

---

[1] بین کھلی ہوئی۔ صاف صاف۔ [2] معیار۔ کسوٹی۔

کلام کی فصاحت

یہ بحث مفرد الفاظ سے متعلق تھی لیکن کلام کی فصاحت میں صرف لفظ کا فصیح ہونا کافی نہیں بلکہ یہ بھی ضرور ہے کہ جن الفاظ کے ساتھ وہ ترکیب میں آئے۔ ان کی ساخت ہیئت[1]، نشست سبکی اور گرانی کے ساتھ اس کا خاص تناسب[2] اور توازن[3] ہو ورنہ فصاحت قائم نہ رہے گی میر انیس کا مصرع ہے۔ ع

"فرمایا آدمی ہے کہ صحرا کا جانور"

صحرا اور جنگل ہم معنی ہیں اور دونو فصیح ہیں میر انیس نے جابجا ان دونوں لفظوں کو استعمال کیا ہے اور ہم معنی ہونے کی حیثیت سے کیا ہے۔ لیکن اگر اس مصرع میں صحرا کے بجائے جنگل کا لفظ استعمال کیا جائے تو یہی لفظ غیر فصیح ہو جائے گا میر صاحب کا ایک شعر ہے ؎

طائر ہوا میں مست ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

یہاں جنگل کے بجائے صحرا لاؤ۔ تو مصرع پھس پھسا ہو جاتا ہے۔
شبنم اور اوس ہم معنی ہیں اور برابر درجہ کے فصیح ہیں لیکن میر صاحب اس شعر میں ؎

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

اگر اوس کے بجائے شبنم کا لفظ لایا جائے تو فصاحت خاک میں مل جائیگی

---

[1] ہیئت صورت، ڈھانچہ [2] تناسب، مناسبت۔ [3] توازن۔ ہم وزن ہونا۔ یکساں ہونا۔

لیکن یہی اوس کا لفظ جو اس موقع پر اس قدر فصیح ہے اس مصرع میں ع
"شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے"
شبنم کے بجائے اوس لاؤ تو فصاحت بالکل ہوا ہو جائے گی۔

اس میں نکتہ یہ ہے کہ لفظ چونکہ ایک قسم کا سُر ہے اس لئے یہ ضرور ہے کہ جن الفاظ کے سلسلہ میں وہ ترکیب دیا جائے ان آوازوں سے اس کو خاص تناسب بھی ہو ورنہ گویا دو مخالف سروں کو ترکیب دینا ہوگا۔ نغمہ اور راگ مفرد آوازوں یا سُروں کا نام ہے۔ ہر سُر بجائے خود دل کش اور دل آویز ہے لیکن اگر دو مخالف سروں کو باہم ترکیب دے دیا جائے تو دونوں مکروہ ہو جائیں گے۔

راگ کے دل کش اور موثر ہونے کا گُر یہی ہے کہ جن سروں سے اس کی ترکیب ہو ان میں نہایت تناسب و توازن ہو۔ الفاظ بھی چونکہ ایک قسم کی صوت اور سُر ہیں، اس لئے ان کی لطافت شیرینی اور روانی اسی وقت تک قائم رہتی ہے جب تک گرد و پیش کے الفاظ بھی کے ہیں ان کے مناسب ہوں مرزا دبیر صاحب کا مشہور مصرع ہے۔ ع
"زیر قدم والدہ فردوس بریں ہے"

اس میں جتنے الفاظ ہیں۔ یعنی زیر، قدم، والدہ، فردوس بریں سب بجائے خود فصیح اور ان کے باہم ترکیب دینے سے جو مصرعہ پیدا ہوتا ہے وہ اس قدر بھدا اور گراں ہے کہ زبان اس کا تحمل[۱] نہیں کر سکتی۔ شاید تم کو خیال ہو کہ مصرعہ کی ترکیب چونکہ فارسی ہو گئی ہے اس لئے ثقل[۲] پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ سیکڑوں شعروں میں اس قسم کی فارسی ترکیبیں ہیں لیکن یہ ثقل

[۱] تحمل بوجھ اٹھانا [۲] ثقل۔ بھاری پن۔

نہیں پایا جاتا۔ مثلاً میر انیس صاحب کہتے ہیں ؎

میں ہوں سردارِ شبابِ چمنِ خلدِ بریں
میں ہوں خالق کی قسم دوشِ محمد پہ مکیں

پہلے مصرعہ میں فارسی ترکیب کے علاوہ توالیِ اضافت[1] بھی موجود ہے لیکن بھدا پن اور ثقیل نہیں ہے۔

جب کسی مصرعہ یا شعر کے تمام الفاظ میں ایک خاص قسم کا توازن توافق[2] پایا جاتا ہے، اس کے ساتھ وہ تمام الفاظ بجائے خود بھی فصیح ہوتے ہیں تو وہ پورا مصرعہ یا شعر فصیح کہا جاتا ہے۔ اور یہی چیز ہے جس کو بندش کی صفائی نشست کی خوبی ترکیب کی دلاویزی، ہم آہنگی، سلاست اور روانی سے تعبیر کرتے ہیں۔ الفاظ کے توازن اور تناسب سے کلام میں جو فرق پیدا ہو جاتا ہے وہ ایک خاص مثال میں آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ میر انیس حضرت علی اکبر کے اذان دینے کی تعریف ایک موقع پر اس طرح کرتے ہیں۔ ع

"تھا بلبلِ حق گو کہ چہکتا تھا چمن میں"

اسی مضمون کو مرزا صاحب دوسرے موقع پر اس طرح ادا کرتے ہیں۔ ع

"بلبل چہک رہا تھا ریاضِ رسول میں"

وہی مضمون ہے۔ وہی الفاظ ہیں لیکن ترکیب کی ساخت نے دونوں شعروں میں کس قدر فرق پیدا کر دیا ہے۔

میر انیس کا تمام کلام اس خوبی سے معمور ہے اور ان کا ہر شعر اس وصف کا مصداق ہے۔ نمونہ کے طور پر ہم چند اشعار اس موقع پر نقل کرتے ہیں ؎

---

[1] توالی۔ اضافت۔ اضافتوں (زیر کسرہ) کا متواتر (برابر برابر) آنا۔ [2] توافق۔ موافقت۔ یکسانی۔

تعریف میں چشمہ کو سمندر سے ملا دوں | قطرہ کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں
ذرہ کی چمک مہر منور سے ملا دوں | کانٹوں کی نزاکت میں گل تر سے ملا دوں

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
ایک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

تھا فوج قاہرہ[۱] میں تلاطم کہ الحذر | تھیں موج کی طرح سے ادھر کی صفیں ادھر
چکر میں تھیں سپاہ کہ گردش میں تھا بھنور | پانی میں تھے نہنگ ابھرتے نہ تھے مگر

فوجیں فقط نہ بھاگی تھیں منھ موڑ موڑ کے
دریا بھی ہٹ گیا تھا کنارے کو چھوڑ کے

چھایا تھا سب پہ رعب عملدار نوجواں | تسلیم کو جھکے ہوئے تھے فوج کے نشاں
گوشہ اماں کا ڈھونڈھ رہی تھی ہر اک کماں | ترکش[۲] بھی تھے ہراس سے کھولے ہوئے زباں

تیروں کا بے گماں تھا ارادہ گریز کا
منھ کند ہو گیا تھا ہر اک تیغ تیز کا

کلام کی اصلی ترتیب کا قائم رہنا

ترکیب الفاظ کے لحاظ سے شعر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ کلام کے اجزا کی جو اصلی ترتیب ہے وہ بحال خود قائم رہے۔ مثلاً فاعل، مفعول، مبتدا، خبر، متعلقات فعل جس ترتیب کے ساتھ ہر وقت بول چال میں آتے ہیں، یہی ترتیب شعر میں بھی قائم رہے اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ شعر میں اس ترتیب کا بعینہٖ قائم رہنا قریب قریب ناممکن

---

۱ قاہرہ زبردست۔ ۲ ترکش۔ تیر رکھنے کی نلی۔

ہے۔ صرف ایک آدھ شعر یا بہت سے بہت شعر دو شعر میں اتفاقیہ یہ بات پیدا ہو جاتی ہے لیکن چونکہ نظم کا درحقیقت سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ اگر اس کو نثر کرنا چاہیں تو ہو سکے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب شعر میں الفاظ کی وہی ترتیب باقی رہے جو نثر میں معمولاً ہوا کرتی ہے۔ اس بنا پر شاعر کو کوشش کرنا چاہیئے کہ اگر اصل ترتیب پوری پوری قائم نہیں رہ سکتی تو بہرحال اس کے قریب پہنچ جائے جس قدر اس کا لحاظ رکھا جائے گا اسی قدر شعر زیادہ صاف برجستہ رواں اور ڈھلا ہوا ہوگا اور اردو میں جہاں تک ہم کو معلوم ہے یہ صفت میر انیس صاحب سے زیادہ کسی کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔

روزمرہ اور محاورہ

جو الفاظ اور جو خاص ترکیبیں اہلِ زبان کے بول چال میں زیادہ مستعمل اور متداول[۱] ہوتی ہیں ان کو روزمرّہ کہتے ہیں۔ روزمرّہ اگرچہ ایک جداگانہ وصف سمجھا جاتا ہے لیکن درحقیقت وہ فصاحت کا ایک فردِ خاص ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ عام بول چال میں وہی الفاظ زبان پر آئیں گے جو سادہ، صاف اور سہل الادا[۲] ہوں اور اگر ان میں کچھ ثقل اور گرانی بھی ہو تو رات دن کے بول چال اور کثرتِ استعمال سے منجھ کر صاف ہو جاتے ہیں روزمرہ کے لئے فصیح ہونا لازم ہے۔ میر انیس کے کلام میں نہایت کثرت سے روزمرہ اور محاورہ کا استعمال پایا جاتا ہے اور اُس پر ان کو ناز بھی تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

مُرغانِ خوش الحانِ چمن بولیں کیا
مر جاتے ہیں سُن کے روزمرّہ میرا

[۱] متداول۔ رائج۔ [۲] سہل الادا۔ آسانی سے ادا ہونے والا

حُسنِ کلام

حُسنِ کلام کا ایک بڑا نکتہ یہ ہے کہ مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے
الفاظ استعمال کئے جائیں۔ لفظ چونکہ آواز کی ایک قسم ہے اور آواز کے مختلف
اقسام ہیں۔ مُہیب[1]، پُر رعب، سخت، نرم، شیریں، لطیف اسی طرح الفاظ بھی
صورت اور وزن کے لحاظ سے مختلف طرح کے ہوتے ہیں۔ بعض نرم اور شیریں
اور لطیف ہوتے ہیں بعض سے جلالت[2] اور شان ٹپکتی ہے۔ بعض سے درد اور
غمگینی ظاہر ہوتی ہے۔ اسی بنا پر غزل میں سادہ، شیریں، سہل اور لطیف الفاظ
استعمال کئے جاتے ہیں۔ قصیدہ میں زوردار اور شاندار الفاظ کا استعمال
پسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح رزم[3]۔ بزم، مدح و ذم[4]۔ فخر وادّعا[5]۔ وعظ و پند
ہر ایک کے لئے جُدا جُدا الفاظ ہیں۔ شعراء میں سے جو اس نکتہ کے آشنا ہیں
اور وہ ان مراتب کا لحاظ رکھتے ہیں اور یہ ان کے کلام کے تاثیر کا بڑا جوہر ہے۔
لیکن جو اس فرقِ مراتب سے واقف نہیں یا ہیں لیکن ایک خاص رنگ
ان پر چڑھ گیا ہے کہ ہر قسم کے مضامین میں ایک ہی قسم کے الفاظ ان کی
زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ ان کا کلام بجز ایک خاص رنگ کے بالکل بے اثر
ہوتا ہے یہی نکتہ ہے کہ سعدی سے رزم فردوسی سے بزم نہیں نبھ سکی۔

میر انیس صاحب نے رزم، بزم، فخر، ہجو۔ نوحہ سب کچھ لکھا لیکن
جہاں جس کا موقع ہوتا ہے اسی قسم کے الفاظ ان کے قلم سے نکلتے ہیں رزمیہ فخر

---

[1] مہیب۔ ڈراونے۔ پُرہیبت۔ [2] جلالت۔ بندگی۔ [3] رزم۔ لڑائی۔
[4] ذم۔ برائی ہجو۔ [5] ادّعا۔ دال کو زیر بمعنی بے دلیل بات کہنا۔ دعوی بے دلیل۔

لکھتے ہیں تو فرماتے ہیں ؎

طاقت اگر دکھاؤں رسالت مآب کی
رکھ دوں زمین پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی

جلال و غیظ کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں :۔

کم تھا نہ ہاہمہ[1] اسدِ کردگار سے
نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم[2] کچھار سے

کیا جانے کس نے روک دیا ہے دلیر کو
سب دشت گونجتا ہے یہ غصّہ ہے شیر کو

دیکھو ان اشعار میں جو الفاظ آئے ہیں، جس طرح ان کے مفہوم میں غیظ و غضب ہے اسی طرح الفاظ کی صوت[3] و لہجہ سے بھی ہیبت و غیظ و غضب کا اظہار ہوتا ہے

(شبلی نعمانی)

۱۔ ہاہمہ۔ گرج۔ رعب، دبدبہ۔ ۲۔ ضیغم۔ شیر۔ ۳۔ صوت۔ آواز۔

شعر کی ماہیت وحقیقت

شاعری کی حقیقت شاعری چوں کہ وجدانی اور ذوقی چیز ہے اس لئے اس کی جامع اور مانع تعریف چند الفاظ میں نہیں کی جاسکتی اس بنا پر مختلف طریقوں سے اس کی حقیقت کا سمجھنا زیادہ مفید ہوگا کہ ان سب کے مجموعہ سے شاعری کا ایک صحیح نقشہ پیش نظر ہوجائے۔

خدا نے انسان کو مختلف اعضا اور مختلف قوتیں دی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے فرائض اور تعلقات الگ ہیں۔ ان میں سے دو قوتیں تمام افعال وارادت کا سرچشمہ ہیں ادراک اور احساس۔ ادراک کا کام اشیا کا معلوم کرنا اور استدلال اور استنباط سے کام لینا ہے۔ ہر قسم کے ایجادات تحقیقات، انکشافات اور تمام علوم وفنون اسی کے نتائجِ عمل ہیں۔

احساس کا کام کسی چیز کا ادراک کرنا یا کسی مسئلہ کا حل کرنا یا کسی بات پر غور کرنا اور سوچنا نہیں ہے۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ جب کوئی مؤثر واقعہ پیش آتا ہے تو وہ متاثر ہوجاتا ہے۔ غم کی حالت میں صدمہ ہوتا ہے، خوشی میں سرور ہوتا ہے حیرت انگیز بات پر تعجب ہوتا ہے یہی قوت جس کو احساس، انفعال، یا فیلنگ سے تعبیر کرسکتے ہیں شاعری کا دوسرا نام ہے، یعنی یہی احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے تو شعر

بن جاتا ہے۔

حیوانات پر جب کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے تو مختلف قسم کی آوازوں یا حرکتوں کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً شیر گونجتا ہے، مور چنگھاڑتے ہیں، کوئل کوکتی ہے، طاؤس ناچتا ہے، سانپ لہراتے ہیں۔ انسان کے جذبات بھی حرکات کے ذریعہ سے ادا ہوتے ہیں لیکن اس کو جانداروں سے بڑھ کر ایک اور قوت دی گئی ہے یعنی نطق اور گویائی اس لئے جب اس پر کوئی قوی جذبہ طاری ہوتا ہے تو بے ساختہ اس کی زبان سے موزوں الفاظ نکلتے ہیں اسی کا نام شعر ہے۔

اب منطقی پیرایہ میں شعر کی تعریف کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ جو جذبات الفاظ کے ذریعہ سے ادا ہوں وہ شعر ہیں اور چوں کہ یہ الفاظ سامعین کے جذبات پر بھی اثر کرتے ہیں یعنی سننے والوں پر بھی وہی اثر طاری ہوتا ہے اس لئے شعر کی تعریف یوں بھی کر سکتے ہیں کہ جو کلام انسانی جذبات کو برانگیختہ کرے اور ان کو تحریک میں لادے وہ شعر ہے۔

ایک یوروپین مصنف لکھتا ہے کہ "ہر چیز جو دل پر استعجاب یا حیرت یا جوش یا اور کسی قسم کا اثر پیدا کرتی ہے شعر ہے۔" اس بنا پر فلک نیلگوں، نجم درخشاں، نسیم سحر، گل گونہ شفق، تبسم گل، خرام صبا نالۂ بلبل، ویرانی دشت، شادابی چمن، غرض تمام عالم شعر ہے۔ یہ آج کل کا خیال ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ حضرت خواجہ فریدالدین عطار نے آج سے چھ سو برس پہلے کہا تھا۔ ع

پس جہاں شاعر بود چوں دیگراں

جو چیزیں دل پر اثر کرتی ہیں بہت سی ہیں مثلاً موسیقی، مصوری، صنعت گری وغیرہ۔ لیکن شاعری کی اثر انگیزی کی حد سب سے زیادہ وسیع ہے۔ موسیقی صرف قوت سامعہ کو محظوظ کر سکتی ہے۔ سامعہ نہ ہو تو وہ کچھ کام نہیں کر سکتی۔ تصویر سے متاثر ہونے کے لئے بینائی شرط ہے لیکن شاعری تمام حواس پر اثر ڈال سکتی ہے۔ باصرہ، ذائقہ، شامہ، لامسہ، سب اس سے لطف اٹھا سکتے ہیں۔ فرض کرو شراب آنکھوں کے سامنے نہیں ہے اس لئے آنکھ اس وقت اس سے حظ نہیں اٹھا سکتی۔ لیکن جب ایک شاعر اس کو آتشِ سیال سے تعبیر کرتا ہے تو ان الفاظ سے ایک موثر منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

کسی چیز کی حقیقت اور ماہیت کے تعین کرنے کا آسان علمی طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس کا کوئی نمایاں وصف لیا جائے پھر یہ دیکھا جائے کہ اس وصف میں اور کیا کیا چیزیں اس کے ساتھ شریک ہیں۔ پھر ان صفات کو ایک ایک کر کے متعین کیا جائے جن کی وجہ سے یہ چیز اپنی اور ہم جنس چیزوں سے الگ اور ممتاز ہو گئی ہے۔

اس قدر سب تسلیم کرتے ہیں کہ شعر کا نمایاں وصف جذبات انسانی کا برانگیختہ کرنا ہے یعنی اس کو سن کر دل میں رنج یا خوشی یا جوش کا اثر پیدا ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت شاعری کو سائنس اور علوم و فنون سے ممتاز کر دیتی ہے۔ شاعری کا تخاطب جذبات سے ہے اور سائنس کا

یقین سے ہے۔ سائنس استدلال سے کام لیتا ہے اور شاعری محرکات کو استعمال کرتی ہے۔ سائنس عقل کے سامنے کوئی علمی مسئلہ پیش کرتا ہے لیکن شاعری احساسات کو دل کش منظر دکھاتی ہے لیکن یہ خاصیت موسیقی، تصویر بلکہ مناظر قدرت میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس لئے کلام یا الفاظ کی قید لگانی چاہئے کہ یہ چیزیں بھی اس دائرہ سے نکل جائیں۔ تاہم خطبہ (لکچر) تاریخ افسانہ اور ڈراما شاعری کی حدیں داخل رہیں گی۔ ان میں اور شعر میں حد فاصل قائم کرنا مشکل ہے۔ زیادہ دقت اس لئے ہوتی ہے کہ اکثر اعلیٰ نظمیں افسانہ کی شکل میں ہوتی ہیں اور اکثر افسانوں میں شاعری کی روح پائی جاتی ہے۔ اس لئے دونوں جب باہم مل جاتے ہیں تو ان میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ افسانہ اسی حد تک افسانہ ہے جہاں تک اس میں خارجی واقعات اور زندگی کی تصویر ہوتی ہے جہاں سے اندرونی جذبات اور احساسات شروع ہوتے ہیں وہاں شاعری کی سرحد آ جاتی ہے۔ افسانہ نگار بیرونی اشیا کا استقصا کے ساتھ مطالعہ کرتا ہے۔ بخلاف اس کے شاعر اندرونی جذبات اور احساسات کی نیرنگیوں کا ماہر بلکہ تجربہ کار ہوتا ہے۔

تاریخ اور شعر کا فرق ایک مثال کے ذریعہ سے اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے۔ ایک شخص جنگل میں جا رہا ہے کسی گوشہ سے ایک مہیب شیر ڈکارتا ہوا نکلا۔ اس کی پر رعب گونج، بھیانک چہرہ، خشم گیں آنکھوں نے اس شخص کے دل کو لرزا دیا۔ یہ شخص کسی کے سامنے شیر کا حلیہ اور شکل و صورت جن

موثر لفظوں میں بیان کرے گا وہ شعر ہے۔

علم الحیوانات کا ایک عالم کسی عجائب خانہ میں جاتا ہے۔ وہاں ایک شیر کٹہرہ میں بند ہے۔ یہ عالم شیر کے ایک ایک عضو کو علمی حیثیت سے دیکھتا ہے اور علمی طریقہ سے کسی مجمع کے سامنے شیر پر لکچر دیتا ہے یہ سائنس یا تاریخ یا واقع نگاری ہے۔

شاعری کے اقسام میں ایک قسم واقعہ نگاری ہے یعنی شاعر خارجی واقعات کی تصویر کھینچتا ہے لیکن اس حیثیت سے نہیں کہ فی نفسہ وہ کیا ہیں بلکہ اس حیثیت سے کہ وہ ہمارے جذبات پر کیا اثر ڈالتی ہیں۔ شاعران اشیاء کے سادہ خط و خال کی تصویر نہیں کھینچتا بلکہ ان میں قوت تخیل سے رنگ بھرتا ہے تاکہ موثر ہو جائے۔ اس تقریر سے شاعری اور واقعہ نگاری کا فرق واضح ہو جاتا ہے لیکن خطابت اور شاعری کی حد فاصل اب بھی نہیں قائم ہوئی خطابت میں بھی شاعری کی طرح جذبات اور احساسات کا برانگیختہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں شاعری اور خطابت بالکل جدا جدا چیزیں ہیں خطابت کا مقصود حاضرین سے خطاب کرنا ہوتا ہے۔ اسپیکر حاضرین کے مذاق معتقدات اور میلان طبع کی جستجو کرتا ہے تاکہ اس کے لحاظ سے تقریر کا ایسا پیرایہ اختیار کرے جس سے ان کے جذبات کو برانگیختہ کر سکے اور اپنے کام میں لائے۔ بخلاف اس کے شاعروں کو دوسروں سے غرض نہیں ہوتی۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ کوئی اس کے سامنے ہے بھی یا نہیں؟ اس کے دل میں جذبات پیدا ہوتے ہیں وہ بے اختیار ان جذبات کو ظاہر کرتا ہے جس طرح

درد کی حالت میں بے ساختہ آہ نکل جاتی ہے، بے شبہ یہ اشعار اوروں کے سامنے پڑھے جائیں تو ان کے دل پر اثر کریں گے۔ لیکن شاعر نے اس غرض کو پیش نظر نہیں رکھا تھا۔ جس طرح کوئی شخص اپنے عزیز کے مرنے پر نوحہ کرتا ہے تو اس کی یہ غرض نہیں ہوتی کہ لوگوں کو سنائے لیکن اگر کوئی شخص سن لے تو ضرور تڑپ جائے گا۔

اصلی شاعر وہی ہے جس کو سامعین سے کچھ غرض نہ ہو لیکن جو لوگ بہ تکلف شاعر بنتے ہیں ان کا بھی فرض ہے کہ ان کے انداز کلام سے مطلق نہ پایا جائے کہ وہ سامعین کو مخاطب کرنا چاہتے ہیں۔ ایک ایکٹر کو خوب معلوم ہے کہ بہت سے حاضرین اس کے سامنے موجود ہیں لیکن اگر ایکٹ کرنے کی حالت میں وہ اس علم کا اظہار کر دے تو سارا پارٹ غارت ہو جائے گا۔ شاعر اگر اپنے نفس کے بجائے دوسروں سے خطاب کرتا ہے دوسروں کے جذبات کو ابھارنا چاہتا ہے، جو کچھ کہتا ہے اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے کہتا ہے تو شاعر نہیں بلکہ خطیب ہے۔ اس سے یہ واضح ہو گا کہ شاعری تنہا نشینی اور مطالعہ نفس کا نتیجہ ہے بخلاف اس کے خطابت لوگوں سے ملنے جلنے اور راہ و رسم رکھنے کا ثمرہ ہے۔ اگر ایک شخص کے اندرونی احساسات تیز اور مشتعل ہیں تو وہ شاعر ہو سکتا ہے لیکن خطیب کے لئے ضرور ہے کہ دوسروں کے جذبات اور احساسات کا نباض ہو۔

شاعری کے اصلی عناصر کیا ہیں؟

ایک عمدہ شعر میں بہت سی باتیں پائی جاتی ہیں۔ اس میں وزن ہوتا ہے

محاکات ہوتی ہے یعنی کسی چیز یا کسی حالت کی تصویر کھینچی جاتی ہے۔ خیال بندی ہوتی ہے، الفاظ سادہ اور شیریں ہوتے ہیں، بندش صاف ہوتی ہے، طرز ادا میں جدت ہوتی ہے لیکن کیا یہ سب چیزیں شاعری کے اجزا ہیں؟ کیا ان میں سے ہر ایک ایسی چیز ہے کہ اگر وہ نہ ہوتی تو شعر شعر نہ ہوتا؟ اگر ایسا نہیں ہے اور قطعاً نہیں ہے تو ان تمام اوصاف میں خاص ان چیزوں کو متعین کر دینا چاہیئے جن کے بغیر شعر شعر نہیں رہتا۔ عام لوگوں کے نزدیک یہ چیز وزن ہے اسی لئے عام لوگ کلام موزوں کو شعر کہتے ہیں۔ لیکن محققین کی یہ رائے نہیں ہے۔ وزن کو شعر کا ایک ضروری جزو سمجھتے ہیں۔ تاہم ان کے نزدیک وہ شاعری کا اصل عنصر نہیں ہے۔

ارسطو کے نزدیک یہ چیز محاکات یعنی مصوری ہے لیکن یہ بھی صحیح نہیں۔ اگر کسی شعر میں تخئیل ہو اور محاکات نہ ہو تو کیا وہ شعر نہ ہوگا؟ سیکڑوں اشعار ہیں جن میں محاکات کے بجائے صرف تخئیل ہے اور باوجود اس کے وہ عمدہ شعر خیال کئے جاتے ہیں۔ شاید یہ کہا جائے کہ محاکات ایسا وسیع مفہوم ہے کہ تخئیل اس کے دائرہ سے باہر نہیں جا سکتی اسلئے تخئیل بھی محاکات ہے لیکن یہ زبردستی ہے۔ آگے چل کر جب ہم محاکات اور تخئیل کی تعریف لکھیں گے تو واضح ہو جائے گا کہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں، گو یا ممکن ہے کہ بعض مثالوں میں دونوں کی سرحدیں مل جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری دراصل دو چیزوں کا نام ہے۔ محاکات اور تخئیل۔ ان میں سے ایک بات بھی پائی جائے تو شعر شعر کہلانے کا مستحق ہوگا، باقی اور اوصاف یعنی سلاست، صفائی، حسن بندش وغیرہ وغیرہ شعر کے اجزائے

اصلی نہیں بلکہ عوارض اور مستحسنات ہیں۔

محاکات کی تعریف محاکات کے معنی کسی چیز یا کسی حالت کا اس طرح ادا کرنا ہے کہ اس شے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے

تصویر اور محاکات میں یہ فرق ہے کہ تصویر میں اگرچہ مادی اشیا کے علاوہ حالات یا جذبات کی بھی تصویر کھینچی جا سکتی ہے چنانچہ اعلیٰ درجے کے مصور انسان کی ایسی تصویر کھینچ سکتے ہیں کہ چہرہ سے جذبات انسانی مثلاً رنج، خوشی، متفکر، حیرت، استعجاب، پریشانی اور بے تابی ظاہر ہو۔ جہانگیر کے سامنے ایک مصور نے ایک عورت کی تصویر پیش کی تھی جس کے تلوے سہلائے جا رہے ہیں۔ تلووں کے سہلاتے وقت چہرہ پر گدگدی کا جو اثر طاری ہوتا ہے وہ تصویر کے چہرے سے نمایاں تھا۔ تاہم تصویر ہر جگہ محاکات کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ سینکڑوں گوناگوں واقعات حالات اور واردات ہیں جو تصویر کے دست رس سے باہر ہیں مثلاً قاآنی ایک موقع پر بہار کا سماں دکھاتا ہے سے

نرمک نرمک نسیم زیر گلاں می خزد
غبغب ایں می مکد عارض آں می مزد
سنبل ایں می کشد گردن آں می گزد
گہ بہ چمن می چمد گہ بہ سمن می وزد
گاہ بہ شاخ درخت گہ بہ لب جوئے بار

یعنی ہلکی ہلکی ہوا آئی پھولوں میں گھسی، کسی پھول کا گال چوم لیا، کسی کی ٹھوڑی چوس لی، کسی کے بال کھینچے، کسی کی گردن دانت سے کاٹی۔ کیاریوں میں کھیلتے کھیلتے چنبیلی کے پاس پہنچی اور درخت کی ٹہنیوں میں ہوتی ہوئی نہر کے کنارے تک پہنچ گئی۔ اس سماں کو مصور تصویر میں کیوں کر دکھا سکتا ہے؟

یہ تو مادی اشیا تھیں، خیالات، جذبات اور کیفیات کا ادا کرنا اور

زیادہ مشکل ہے۔ تصویر اس سے کیوں کر عہدہ برآ ہو سکتی ہے مثلاً اس شعر میں

نسب نامہ دولت کیقباد ورق بر ورق ہر سوئے بر د باد

یہ خیال ادا کیا گیا ہے کہ دارا کے مرنے سے کیانی خاندان بالکل برباد ہو گیا۔ یہ خیال تصویر کے ذریعہ سے کیوں کر ادا ہو سکتا ہے۔

ایک بڑا فرق عام مصوری اور شاعرانہ مصوری میں یہ ہے کہ تصویر کی اصلی خوبی یہ ہے کہ جس چیز کی تصویر کھینچی جائے اس کا ایک ایک خال و خط دکھایا جائے ورنہ تصویر ناتمام اور غیر مطابق ہو گی۔ بخلاف اس کے شاعرانہ مصوری میں یہ التزام ضروری نہیں۔ شاعر اکثر صرف ان چیزوں کو لیتا ہے اور ان کو نمایاں کرتا ہے جن سے جذبات پر اثر پڑتا ہے باقی چیزوں کو وہ نظر انداز کرتا ہے یا انکو دھندلا رکھتا ہے کہ اثر اندازی میں ان سے خلل نہ آئے۔ فرض کرو کہ ایک پھول کی تصویر کھینچی ہو تو مصور کا کمال یہ ہے کہ ایک ایک پنکھڑی اور ایک ایک رگ و ریشہ دکھائے لیکن شاعر کے لئے ضروری نہیں۔ ممکن ہے کہ وہ ان چیزوں کو اجمالی اور غیر نمایاں صورت میں دکھائے تاہم مجموعہ سے وہ اثر پیدا کر دے جو اصلی پھول کے دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔

ایک اور بڑا فرق مصوری اور محاکات میں یہ ہے کہ مصور کسی چیز کی تصویر کھینچنے سے زیادہ سے زیادہ وہ اثر پیدا کر سکتا ہے جو خود اس چیز کو دیکھنے سے پیدا ہوتا لیکن شاعر باوجود اس کے کہ تصویر کا ہر جزو نمایاں کر کے نہیں دکھاتا تاہم اس سے زیادہ اثر پیدا کر سکتا ہے جو اصل چیز کے دیکھنے سے پیدا ہو سکتا ہے۔ سبزہ پر شبنم دیکھ کر وہ اثر نہیں پیدا ہو سکتا جو اس شعر سے ہو سکتا ہے

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

تصویر کا اصلی کمال یہ ہے کہ اصل کے مطابق ہو اور اگر مصور اس

امر میں کامیاب ہوگیا تو اس کو کامل فن کا خطاب مل سکتا ہے۔ لیکن شاعر کو اکثر موقعوں پر دو مشکل مرحلوں کا سامنا ہوتا ہے یعنی نہ اصل کی پوری پوری تصویر کھینچ سکتا ہے کیوں کہ بعض جگہ اس قسم کی پوری مطابقت احساسات کو برانگیختہ نہیں کر سکتی نہ اصل سے زیادہ دور ہو سکتا ہے ورنہ اس پر اعتراض ہوگا کہ صحیح تصویر نہیں کھینچی اس موقع پر اس کو تخئیل سے کام لینا پڑتا ہے۔ وہ ایسی تصویر کھینچتا ہے جو اصل سے آب و تاب اور حسن و جمال میں بڑھ جاتی ہے لیکن وہ قوت تخئیل سے سامعین پر یہ اثر ڈالتا ہے کہ یہ وہی چیز ہے۔ لوگوں نے اس کو امعان نظر سے نہیں دیکھا تھا اس لئے اس کا حسن پورا نمایاں نہیں ہوا تھا۔

تخئیل

تخئیل کی تعریف ہنری لوئس نے یہ کی ہے وہ قوت جس کا یہ کام ہے کہ ان اشیا کو جو مرئی نہیں ہیں یا جو ہمارے حواس کی کمی کی وجہ سے ہم کو نظر نہیں آتیں ہماری نظر کے سامنے کر دیے" لیکن یہ تعریف پوری جامع اور مانع نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی چیزوں کی منطقی جامع اور مانع تعریف ہو بھی نہیں سکتی۔

تخئیل دراصل قوت اختراع کا نام ہے۔ عام لوگوں کے نزدیک منطق یا فلسفہ کا موجد صاحب تخئیل نہیں کہا جا سکتا بلکہ اگر خود کسی فلسفہ داں کو اس لقب سے خطاب کیا جائے تو اس کو عار آئے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ فلسفہ اور شاعری میں قوت تخئیل کی یکساں ضرورت ہے۔ یہی قوت تخئیل ہے جو ایک طرف فلسفہ میں ایجاد اور اکتشاف مسائل کا کام دیتی ہے۔

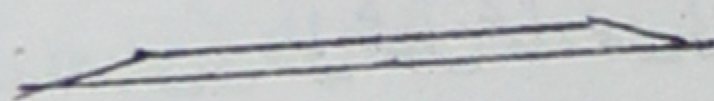
اور دوسری طرف شاعری میں شاعرانہ مضامین پیدا کرتی ہے۔ چوں کہ اکثر
سائنس داں شاعری کا مذاق نہیں رکھتے اور شعرا فلسفہ اور سائنس سے
نامانوس ہوتے ہیں اس لئے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ قوت تخئیل کو فلسفہ
اور سائنس سے تعلق نہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ بے شبہہ عام سائنس یا
فلسفہ جاننے والے جن میں قوت ایجاد نہیں قوت تخئیل نہیں رکھتے۔ لیکن
جو لوگ کسی مسئلہ یا فن کے موجد ہیں ان کی قوت تخئیل سے کون انکار کر سکتا ہے۔
نیوٹن اور ارسطو میں اسی قدر زبردست قوت تخئیل تھی جس قدر ہومر اور فردوسی
میں۔ البتہ دونوں کے اغراض و مقاصد مختلف ہیں اور دونوں کی قوت تخئیل
کے استعمال کا طریقہ الگ الگ ہے۔ فلسفہ اور سائنس میں قوت تخئیل کا
استعمال اس غرض سے ہوتا ہے کہ ایک علمی مسئلہ حل کر دیا جائے۔ لیکن

شاعری میں تخئیل سے یہ کام لیا جاتا ہے کہ جذبات انسانی کو تحریک ہو۔ فلسفی
کو صرف ان موجودات سے غرض ہے جو واقع میں موجود ہیں۔ بخلاف اس کے
شاعر ان موجودات سے بھی کام لیتا ہے جو مطلق موجود نہیں۔ فلسفہ کے دربار
میں ہما، سیمرغ، گاوزمیں، تخت سلیماں کی مطلق قدر نہیں۔ لیکن یہی چیزیں
ایوان شاعری کی نقش و نگار ہیں۔ فلسفی کی زبان سے اگر سیمرغ زریں پر کا لفظ
نکل جائے تو ہر طرف سے ثبوت کا مطالبہ ہوگا۔ لیکن شاعر اس قسم کے فرضی
مخلوقات سے اپنا عالم خیال آباد کرتا ہے اور کوئی اس سے ثبوت کا طالب
نہیں ہوتا۔ کیوں کہ فلاسفر کی طرح وہ کسی مسئلہ کی تعلیم کا دعویٰ نہیں کرتا بلکہ

وہ ہم کو صرف خوش کرنا چاہتا ہے اور بے شبہ وہ اس میں کامیاب ہوتا ہے۔
ایک پھول کو دیکھ کر سائنس داں تحقیقات کرنا چاہتا ہے کہ وہ نباتات کے
کس خاندان سے ہے۔ اس کے رنگ میں کن رنگوں کی آمیزش ہے۔ اس
کی غذا زمین کے کن اجزا سے ہے۔ اس میں نر و مادہ دونوں کے اجزا ہیں یا صرف
ایک کے؟ لیکن شاعر کو ان چیزوں سے غرض نہیں۔ پھول دیکھ کر اس کو بے
اختیار یہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ ع

'اے گل بہ تو خرسندم تو بوئے کسے داری'

چاند کی نسبت ایک ہیئت داں کو ان مسائل سے غرض ہے کہ وہ
کن عناصر سے بنا ہے؟ آباد ہے یا ویران؟ روشن ہے یا تاریک؟ سمندر
کے مد و جذر سے اس کو کیا تعلق ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن شاعر کو چاند سے صرف
یہ غرض ہے کہ وہ معشوق کا روئے روشن ہے۔ شاعر کے سامنے (قوت تخئیل کی
بدولت) تمام بے حس اشیا جان دار چیزیں بن جاتی ہیں۔ اس کے کانوں میں
ہر طرف سے خوش آیند صدائیں آتی ہیں زمین، آسمان، ستارے بلکہ ذرہ
ذرہ اس سے باتیں کرتا ہے۔



ٹوٹا ہوا کھنڈر

ہماری نظریں جس شوق سے ایک ٹوٹے ہوئے تارے کے ساتھ دوڑتی ہیں۔ اس طرح ان آہستہ خرامی کی ادا دکھانے والے شاہدانِ فلک یعنی تاروں میں سے کسی ایک کے بھی چہرۂ زیبا کی طرف نہیں دوڑتیں چاند اور سورج کے گورے اور روشن چہرے روز ہی اپنی آب و تاب اور اپنے حسن کی بہار دکھایا کرتے ہیں مگر ہم نے انھیں اس توجہ و مصروفیت سے کبھی نہیں دیکھا جیسے کہ اُس روز دیکھتے ہیں، جب یہ گہنائے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کے مٹے ہوئے حُسن۔ بگڑے ہوئے بناؤ اور ان کے ماند چہروں پر ایک حسرت برستی ہوتی ہے۔

بعینہٖ اسی طرح جس متاثر دل اور محویت کی نگاہ سے ہم کسی ٹوٹے ہوئے کھنڈر، منہدم قلعے اور شکستہ ایوان کو دیکھتے ہیں۔ آباد محلوں یا شان و شوکت قصروں اور بارونق ایوانوں کو ہرگز نہیں دیکھتے۔ دنیا کے مشہور و معروف شہروں میں جاتے اور ان کی عالی شان عمارتوں کی سیر کرتے اور ان کے خوش نما محلوں اور سربفلک قصروں کے پاس سے ہو کر گزرتے ہیں لیکن ان میں ہمیں کبھی کوئی ایسی بات نہیں نظر آتی کہ خواہ مخواہ ٹھہرنا پڑے اور انھیں غور و دلچسپی سے دیکھنے پر مجبور ہو جائیں۔ مگر اس کے مقابل جب

ہمارا گذر اُن پُرانے شکستہ محلوں، افتادہ ایوانوں اور منہدم قلعوں کے پاس سے ہوتا ہے تو حسرت پُر درد آواز سے ہمیں پکارتی عبرت چونکاتی اور بیکسی ہمارا دامن پکڑ لیتی ہے اور ہزار عجلت ہو مگر ہمارا قدم رُک ہی جاتا ہے۔ کسی زبردست کشش سے مجبور ہو کر ہم وہاں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ نظر اُٹھاتے ہی عبرت کی ایک تصویر ہمارے پیش نظر ہو جاتی ہے اور ہم اس داستانِ حسرت کو سننے لگتے ہیں جسے وہ اپنی خاموش زبان سے سناتے اور اپنی متانت کے چشم و ابرو سے اس میں اثر پیدا کرتے ہیں۔

اے دنیا کے آباد اور بارونق محلو! تم میں چاہے کیسے ہی دولت کے کرشمے اور جاہ و ثروت کے نمونے ہوں۔ مگر وہ کشش اور دلچسپی ہرگز نہیں جو ان شکستہ عمارتوں اور منہدم آثار سلف بلکہ گری پڑی اینٹوں میں ہے۔ تمہیں قدامت کی اُن عبرت خیز یادگاروں پر رشک آتا ہوگا اور بیشک آنا چاہیئے۔ تم چند روزہ دولت کے نشہ میں اس قدر چور ہو کہ نہ تم میں ایسے سچے جذبات ہیں نہ تمہاری حس اس قدر صائب ہے۔ تم میں یہ مادہ ہی نہیں رہا کہ دوسروں کے انجام سے اپنی ہستیٔ موہوم کے متعلق کوئی سبق حاصل کرو۔

دیکھو! ان عالی شان آباد اور بارونق قصروں میں ہر قسم کی دھوم دھام ہے۔ ان کا عروج عنفوانِ شباب کے مزے لے رہا ہے۔ ان میں ہر طرح کی دلچسپیوں کے سامان ہیں، شان و شوکت ہے۔ دولت و حشمت ہے۔ مگر ان سب چیزوں میں طفلانہ مزاجی کی بُو آرہی ہے۔ سب کچھ ہے لیکن ایک فلسفی اور عالی خیال حکیم کے مذاق کی دلچسپیاں نہیں ہیں۔

اے فخر و ناز سے سر اُٹھانے والے ایوان! تجھ میں چہل پہل ہے۔ شور و ہنگامہ ہے۔ آنے جانے والے بھیڑ لگائے ہوئے ہیں۔ ایک میلا سا لگا ہوا ہے۔ دولت کے کرشمے ہیں۔ امارت کی خود پرستیاں ہیں اور اس دولت پر جو خدا کی سب سے بڑی رحمت و نعمت ہے۔ ہر قسم کے ظلم ہو رہے ہیں۔ تجھ میں غرور ہے اور خودستائی ہے۔ ناعاقبت اندیشی ہے اور نشۂ بادِ نخوت ہے جو لوگ تیرے سامنے کھڑے ہوئے چلا چلا کے دعائیں دے رہے ہیں۔ ان میں جس قدر خوشامد اور چاپلوسی ہے۔ اس سے زیادہ اور بدرجہا زیادہ ان لوگوں کی بے زبانی کی بددعائیں اثر ہے جو تیرے ستائے ہوئے ہیں اور تیرے قدموں کے پاس خاموش کھڑے ہوئے ہیں۔

افسوس تو اپنی شانداری و خوش نمائی پر نازاں ہو کر منہدم محلوں اور سرنگوں ایوانوں کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتا اور اپنی موجودہ رونق پر اترایا جاتا ہے، مگر یہ نہیں دیکھتا کہ تیرے دامن میں کیسے کیسے دھبے ہیں اور تیرا آغوش کس قدر ناپاک ہے۔ تجھ میں دنیا بھر کی بداخلاقیاں اور ہر قسم کی سیاہ کاریاں ہیں۔ تجھ میں عیش پرستیاں اور ناعاقبت اندیشیاں ہیں۔ تجھ میں انتہا درجہ کی غفلت ہے اور نہایت ہی خطرناک۔ نکبت۔ تجھ میں حقیقت اور اصلیت کا نام و نشان نہیں۔ بلکہ جو کچھ ہے نمائش اور بناوٹ ہے۔ تیرے خوبصورت دروازوں پر پُرتکلف اور نظر فریب پردے پڑے ہوئے ہیں۔ مگر وہ پردے ان سے زیادہ موٹا اور

سنگین ہیں جو تیرے مکینوں کی آنکھوں پر پڑے ہوئے ہیں تجھ میں وہی لوگ آتے ہیں جو تیرے اصل دشمن ہیں اور وہ لوگ تجھ سے دور ہی دور بھاگتے ہیں۔ جو تیری خرابیوں۔ تیرے نقصانوں۔ اور تیری نکبتوں کو بخوبی سمجھ گئے ہیں۔ اور جو تیرے حقیقی دوست ہیں۔ ہمیں صاف نظر آرہا ہے کہ تو نے اپنے بدخواہوں اور دشمنوں کو گود میں بٹھا لیا ہے۔ اور دوستوں اور خیر اندیشوں پر اپنا دروازہ بند کر دیا ہے۔ افسوس! نہ اپنے سچے دوستوں کے لئے تیرے آغوش میں جگہ ہے اور نہ تیرے کمبنوں میں ان کی قدر کرنے کی لیاقت ہے۔ آہ! تو وہ شکر بن گیا ہے جس پر بھڑیں بیتابی اور فریفتگی سے دوڑ دوڑ کر گرتی ہیں جو کسی دن تیرے کمبنوں ہی کے ڈنک ماریں گی۔

تیرے سامنے نوکروں چاکروں کا ہجوم ہے چوبدار اور شاگرد پیشہ دوڑ رہے ہیں۔ نوبت بج رہی ہے اور طرح طرح کے نغمے سُنے جا رہے ہیں۔ شان و شوکت کے اظہار اور دولتمندی کا ٹھاٹھ دکھانے کے لئے بہت سا جلوس جمع ہے مگر افسوس کہیں یہ وہ جلوس ہی نہ ہو جو مردے کو آخری دھوم دھام کے ساتھ قبر کی طرف لے جاتا ہے۔

اے بدکاریوں کے گھر اور اے شہوت پرستیوں کے نشیمن تیری ظاہری نمایش چاہے کیسی ہی نظر فریب ہو۔ اور تو اپنے دکھاوے کی باتوں سے چاہے کیسا ہی دھوکا دیتا ہو۔ مگر تیرا باطنی رُخ اس قدر تیرہ و تار ہے کہ تو وہ کاجل کی کوٹھری بنا ہوا ہے جس میں اگر کوئی ایک گھڑی کو بھی آ جاتا ہے، تو اس کے دامن میں دھبہ ضرور لگ جاتا ہے۔

تیرے مکینوں نے صفحاتِ تاریخ کو کبھی عاقبت اندیشی کی نظر سے دیکھا ہوتا تو انھیں نظر آتا کہ ان شکستہ ومنہدم ایوانوں میں جو انقلاب زمانہ کی مار کھا کر اور بیوفائی روزگار کا تجربہ اُٹھا کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے ہیں۔ کبھی تجھ سے زیادہ شان وشوکت اور دھوم دھام تھی۔ ان کی سطوت اور ان کا جبروت تیرے رعب داب سے کہیں زیادہ چڑھا تھا۔ جو قوت اور جیسی حکومت ان ٹوٹے کھنڈر والوں کو نصیب تھی تیرے مکینوں کو ہرگز نہ نصیب ہو گی۔ اس لئے کہ اب پبلک کی قوتِ امارت شاہی کی قوت سے بڑھ گئی ہے اور روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ نہ اب ایسے بادشاہ ہوں گے اور نہ ویسے اُمرا و رُوسا مگر انھیں بھی زمانہ نے تیرے مکینوں کی طرح دھوکا دیا وہ غلط فہمی سے یہ سمجھ گئے کہ دنیا کا ہمیشہ یہی رنگ رہے گا اور اسی غلطی و ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ ہے کہ ان کے قصر و ایوان آج اس حالت میں پڑے ہیں کہ دوسروں کے لئے سرمایۂ عبرت اور تیرے لئے آیندہ قسمت کی تصویریں ہیں اور قدرت نے ان کے بگڑے ہوئے حُسن۔ اُن کی حسرت و یاس ان کی عبرتناک صورت اور ان کی خاموش زبان میں وہ درد اور اثر پیدا کر دیا ہے کہ جس کشش سے وہ ہمارے دلوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ تو نہیں کھینچ سکتا۔

اے سراپا عروج عالی شان قصر! جس میں طفلانہ مزاجیوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ تو ایک گھڑی کے لئے اپنی اقبال مندی پر ناز کرکے اور اپنی خود پرستی و خود نمائی کو چھوڑ کر ذرا یہ تو دیکھ کہ اس ٹوٹے پھوٹے کھنڈر میں کیا کیا

باتیں ہیں جو تجھ سے دور ایک نہایت ہی خاموش اور سنسان مقام میں کھڑا ہے، اور اپنی زبانِ حال سے عجیب حسرت و درد کے لہجے میں قدامت کی داستانیں سُنا رہا ہے۔

وہ تاریخ کا ایک بوسیدہ اور کرم خوردہ ورق ہے۔ کسی اگلی بزمِ طرب اور گزشتہ صحبتِ عیش کے گُل ہونے کے قریب پہنچی ہوئی شمع ہے، اس کے نقش و نگار کسی گزرے اور مِٹے حُسن کے بگڑے ہوئے خط و خال ہیں۔ اس کے شکستہ اور گرے ہوئے کنگرے وہ سر ہیں جنہیں سرکشی کے جرم میں زمانہ کے بے رحم ہاتھ نے مار مار کر زبردستی اپنے آگے زمین پر جھکا دیا۔ وہ مجسم کتابِ نصیحت اور مرقعِ عبرت ہو رہا ہے، ان سرکشوں کی سرگزشت سُناتا ہے۔ جو اپنے سامنے کسی کی ہستی نہ سمجھتے تھے۔ اور آخر قدرت کے دربار سے سزایاب ہوئے۔ ان حقیقت شناسوں کو یاد دلاتا ہے جو دُنیا کی بے ثباتی دیکھ کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔ نمائش اور خود پرستی کے سارے سامان اس سے چھین لئے گئے۔ اور اب جو کچھ رہ گیا وہ صرف حقیقت و اصلیت ہے۔ اب اس میں نہ وہ چند روزہ دولت کا غرور ہے اور نہ وہ امارت کی بدمستی و خود فراموشی نہ مستعار جاہ و حشمت کی نیرنگیاں ہیں اور نہ غیر پائدار شان و شوکت کی خود پرستیاں۔

اے پُرانے ایوان کے ٹوٹے ہوئے کھنڈر! تجھ میں ایک صاحبِ باطن صوفی صافی کی ایسی سادہ مزاجی ہی نہیں بلکہ محویت و از خود رفتگی بھی ہے۔ دُنیا ہر پُرانی چیز کو ایک متبرک اور دَورِ اوّلیں کی یادگار سمجھ کر ادب

وعزت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اسی خیال سے اب وہ تیرا ادب بھی کرنے لگی ہے، اور جس طرح دنیا کے سب لوگ کسی تارک الدنیا مردِ خدا کی زیارت کے لئے بڑے شوق سے جاتے ہیں، اسی طرح اب تیری زیارت کے لئے بھی ہر ملک کے قافلے روانہ ہونے لگے ہیں۔

مصر میں جاکر وہ ممفس اور تھیبنس کے سنسان ویرانوں میں کھڑے ہوتے ہیں اور تجھے ایک عقیدت کیش کی طرح نہایت ادب کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

شام میں وہ بعلبک اور پامیرا کے گرے پڑے پتھروں پر کھڑے ہو کر تیرا دلکش جلوہ دیکھتے ہیں۔ اور تیرے کائی بھرے دامن کو کسی کے متبرک دامن کی طرح آنکھوں سے لگاتے ہیں۔

بغداد و موصل کے قریب وہ بابل و نینوا کی افتادہ درو دیوار میں ایک ہیبت بھرے دل سے آہستہ آہستہ قدم رکھتے ہوئے جاتے ہیں۔ اور خلوص دلی و عقیدت کیشی سے تیرے قدم چومتے ہیں۔

ایلورا اور ایجنٹا کے پہاڑوں میں کھدے ہوئے پُر ہیبت و عظمت مقاموں میں وہ تیرا ادب کرتے ہوئے قدم رکھتے ہیں۔

اور دہلی مرحوم کی پُر حسرت اُفتادہ عمارتوں میں اب تیرے لئے جن آداب کا وہ لحاظ رکھتے ہیں شاید شاہی کے اس رعب و داب کے زمانہ میں نہ رکھتے ہوں گے۔

بہرحال جہاں جہاں تیرا جلوہ نظر آرہا ہے وہاں اگرچہ حسرت ہی

حسرت برس رہی ہے۔ اور سو اسنسان منظر اور بھیانک محرابوں اور خاموش دہا شکستہ ستونوں کے کچھ نہیں ہے۔ مگر ہر طرف کے قافلوں کا رُخ زیادہ تر تیری ہی طرف پھر گیا۔ اس لئے کہ جیسا اچھا سبق تیری خاموش صحبت اور تیری پُر جلال متانت انھیں دیتی ہے۔ ویسا نہ کسی مدرسے میں مل سکتا ہے اور نہ کسی صحبتِ وعظ میں اور کیونکر نہ ہو۔ جس طرح جوانی کی بے اعتدالیوں سے بڑھاپے میں متنبہ ہو کر کوئی باخدا اور نیک نفس و پاک باطن ہو جاتا ہے اسی طرح اے اگلے زمانہ کے منہدم ایوان! تو بھی ساری نمائشوں کُل اخلاقی بُرائیوں اور سارے عیوب کو دور کر کے پاک صاف اور پاک باطن ہو گیا ہے۔

اگلی سیاہ کاریوں کے دھبے تیرے دامن سے دھل گئے۔ اور اب تیرا دروازہ ان بد اخلاقیوں کے لئے کبھی نہ کھلے گا۔ وہ پُرانی بد مستیاں اور خود پرستیاں تجھ سے دور ہو گئیں۔ اور اب پھر وہ بے حیائی و بے شرمی کی صحبتیں تجھ میں کبھی نہ ہوں گی۔ اب تیرا سکوت اُن حقیقت شناسوں کو یاد دلاتا ہے جو دنیا کی بے ثباتی دیکھ کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔ اور تیری تنہائی اور سُنسان حالت اُن پاکبازوں اور مرتاض ولیوں کی معصومانہ صورت دکھاتی ہے جنہوں نے دنیا کے ہر رنگ کو پھیکا اور بے مزہ دیکھ کر ترکِ لذات کر دیا ہے۔
اب تجھ میں وہ بدکاریاں کبھی نہ آئیں گی جو عیش پرستی کے وقت

دنیا و مافیہا در کنار خدا کو بھی بھول جاتے تھے اور ان کی بدکاری کی صحبتوں کا سماں اب کبھی تیری ٹوٹی پھوٹی محرابوں اور شکستہ چھتوں کے نیچے نہ نظر آئے گا۔ وہ تجھ میں اب قدم بھی رکھیں گے تو خدا سے ڈرتے ہوئے اور اپنے انجام کی ہولناک تصویر دیکھ دیکھ کر سہمتے اور کانپتے ہوئے، اب جس مخلوق نے تجھے اپنا نشیمن قرار دیا ہے وہ بھی دنیا سے ویسا ہی متنفر ہے جیسا کہ تو ہے۔ ابابیلیں تیری گری پڑی چھتوں میں اپنی مسافروں کی سی رات کاٹتی ہیں۔ چمگادڑوں کے فتنوں سے بچنے کے لئے تیرے دامن میں آ کر پناہ لیتی ہیں اور اُسی وقت تجھے چھوڑتی ہیں جب دُنیا کی ہر بُرائی و بدکاری پر رات آ کر اپنا پردہ ڈال دیتی ہے۔ اُلّو نے تجھے اپنی شب بیداری کی خانقاہ بنایا ہے۔ جہاں وہ گویا سارے عالم سے الگ ہو کر ضربیں لگاتا اور اس خدا کو یاد کرتا ہے جس کی عظمت و جلال کا جلوہ تیرے سناٹے میں سب جگہ سے زیادہ وضاحت کے ساتھ نظر آتا ہے۔

اودھ کی آخری صحبت

اب ہم جُدا جُدا بیان کرنا چاہتے ہیں کہ دہلی سے لکھنؤ میں کون کون سی چیزیں آئیں اور یہاں آ کے انھوں نے کیا رنگ پکڑا؟ سب سے مقدم اردو زبان ہے جو دہلی کے ان شرفا اور سرداران فوج کی زبان تھی جو اب برہان الملک بہادر کے ساتھ لکھنؤ میں آئے تھے۔ یہ زبان دہلی میں پیدا ہوئی اور اس کی شاعری کا آغاز دکن سے ہوا۔ ولی گجراتی نے دہلی میں آ کے اپنا دیوان پیش کیا اور اپنے نغمۂ دل کش سے اہلِ زبان کو خوابِ غفلت سے جگایا۔ اس نغمے میں کچھ ایسا جادو تھا کہ سُنتے ہی سب کی زبان پر یہی نغمہ جاری ہو گیا اور دہلی میں اردو شاعری شروع ہو گئی۔

ابتداءً چند ہی بزرگ تھے جنھوں نے استادی کی شان سے دہلی میں دادِ سخن دینا شروع کی۔ مگر اس زمانے کو اگر اردو زبان کی طفلی نہیں تو اردو شاعری کا بچپن کہنا چاہیے۔ دنیائے اردو کے سابقین الاولین میں سب سے زیادہ صاحب علم و فضل اور سب سے بڑے باکمال خان آرزو تھے، جنھیں مولانا آزاد مرحوم نے دوسرے دور شاعری میں رکھا ہے۔ زمانۂ بعد کے بڑے بڑے باکمال جن میں سودا، میر، مرزا مظہر جان جاناں اور خواجہ میر درد شامل ہیں، سب ان کے شاگرد تھے۔ شاعری اور کمال زبان دانی

کی لکھنؤ میں آنے کی بنیاد ان ہی استاد اول خان آرزو سے پڑی۔ نواب شجاع الدولہ کے ماموں سالار جنگ نے کمال قدر دانی سے انھیں لکھنؤ بلوایا اور ایک زمانے تک اودھ میں اقامت گزیں رہ کے وہ شجاع الدولہ کی مسند نشینی کے دو برس بعد ۱۱۶۹ھ (سنہ ۱۱۸۴ محمدی مطابق ۱۷۵۲ء) میں خاص لکھنؤ کے اندر رہ گزار آخرت ہوئے۔ وہی پہلے استاد اردو شاعری کے تھے اور ان ہی سے اردو شعر و سخن کے لکھنؤ میں آنے کی بنیاد پڑی مگر افسوس کہ ان کی ہڈیاں سرزمین لکھنؤ کے دامن شوق سے چھین کے خاک دہلی کو سونپی گئیں۔

اس کے بعد اسی دور کے دوسرے نامی استاد سخن اشرف علی خاں فغاں نے جو احمد شاہ بادشاہ کے کوکا تھے، قدر دانی کی تلاش میں لکھنؤ کی راہ لی۔ شجاع الدولہ نے نہایت ہی تعظیم و تکریم کی۔ ہاتھوں ہاتھ لیا اور ایک زمانے تک اپنے دربار میں رکھا۔ مگر شعرا نازک خیال سے زیادہ نازک دماغ ہوا کرتے ہیں۔ کسی خفیف سی بات پر روٹھ کے عظیم آباد چلے گئے اور شجاع الدولہ کی وفات سے دو برس پہلے وہاں پیوند زمیں ہو گئے۔

اب مولانا آزاد کا مقرر کیا ہوا تیسرا دور شاعری شروع ہوا۔ جب کہ خان آرزو کے شاگرد نظم اردو پر حکومت کر رہے تھے۔ اس زمانے کی حالت دیکھنے سے نظر آتا ہے کہ دہلی اپنے باکمالوں کو اپنے آغوش میں سنبھال نہیں سکتی۔ ہر طرح کے صاحبان کمال اس کی سواد سے نکلتے چلے جاتے ہیں اور جو جاتا ہے پھر نہیں آتا۔ اس کے مقابل لکھنؤ کی یہ حالت ہے کہ جو صاحب فن آتا ہے چاہے کہیں کا ہو یہیں کا ہو جاتا ہے۔ مرزا رفیع سودا، میر تقی میر،

سید محمد میر سوز جو اس تیسرے دَور کے ہمیران سخن ہیں سب دہلی چھوڑ چھوڑ کے لکھنؤ آئے اور یہیں پیوند زمین ہو گئے۔

اس کے علاوہ جو باکمالان سخن اس زمانے میں وارد لکھنؤ ہوئے یہیں کے ہو گئے۔ مرزا جعفر علی حسرت، میر حیدر علی حیران، خواجہ حسن حسن، میرزا فاخر مکین۔ میر ضاحک۔ بقاء اللہ خاں بقا۔ میر حسن دہلوی، میر ضاحک کے فرزند (صاحب مثنوی) اور ان ہی کے ایسے بیسیوں شعرا ہیں۔ میر قمر الدین منت، میر ضیاء الدین ضیا۔ اشرف علی خاں فغاں دہلی سے لکھنؤ میں آ کے ایک مدت تک رہے اور یہیں چمکے۔ مگر آخر میں بیرونی قدر دانوں کی کشش سے کلکتے اور عظیم آباد میں جا کے نذر اجل ہوئے۔ شیخ محمد قائم قائم کا انتقال اگرچہ ان کے وطن نگینے میں ہوا مگر وہ بھی ایک مدت تک اسی لکھنؤ کی سبھا کے ایک ایکٹر تھے۔

صرف میرزا مظہر جان جاناں اور خواجہ میر درد کے ایسے چند بزرگ دہلی میں پڑے رہ گئے، جن کو فقیرانہ قناعت کی وجہ سے دہلی میں قدم جمانے کا موقع مل گیا تھا اور سجادہ نشینی کی وجہ سے اپنی مسند درویشی کو نہ چھوڑ سکتے تھے۔ غرض شاعری کا یہ تیسرا دور وہ زمانہ ہے جب کہ دہلی کی سبھا وہاں سے اکھڑ کے لکھنؤ میں جم رہی تھی اور لکھنؤ میں ایک جوش قدر دانی تھا جس سے ہندوستان کی تاریخ خالی ہے۔

اب چوتھا دور شروع ہوا۔ اس کے ارکان بھی اگرچہ دہلی و اکبر آباد وغیرہ کی خاک سے پیدا ہوئے تھے مگر سب کی شاعری لکھنؤ ہی میں چمکی، یہیں سے

ان کا نام مشہور ہوا۔ یہیں کے مشاعروں کے میر مجلس تھے۔ یہ لوگ علی العموم یہیں سے نکلے۔ یہیں عروج پایا اور یہیں مرکھپ گئے۔ اس دور کے رکن رکین جرأت۔ سید انشا۔ مصحفی۔ قتیل اور رنگین وغیرہ تھے۔ یہ لوگ اپنے عہد میں زبان پر حکومت کر رہے تھے اور ان کی شاعری کا غلغلہ اس قدر بلند تھا کہ ان کے سامنے کسی اردو شاعر کا نام چمک ہی نہ سکا ان سب کی ہڈیاں کہاں ہیں؟ لکھنؤ کی خاک میں۔

اس زمانے میں دہلی کے صاحبان مذاق جس کثرت سے لکھنؤ میں آ رہے تھے، اس کا اندازہ سید انشا کی ایک روایت سے ہو سکتا ہے جس میں انھوں نے اس عہد کے ایک شریف وضع دار بڈھے اور نورا نام ایک کسبی کی نقل کی ہے۔ وہ بزرگ اور کسبی دونوں دہلی کے ہیں مگر دونوں لکھنؤ میں باتیں کر رہے ہیں۔ بی نورا کہتی ہیں "اجی آؤ میر صاحب! تم تو عید کا چاند ہو گئے۔ دلی میں آتے تھے دو دو پہر رات تک بیٹھتے تھے۔ لکھنؤ میں تمہیں کیا ہو گیا کہ کبھی صورت بھی نہیں دکھاتے۔ اب کی کربلا میں کتنا میں نے ڈھونڈھا کہیں تمہارا اثر آثار معلوم نہ ہوا۔ ایسا نہ کیجیو کہ آٹھوں میں نہ چلو۔ تمہیں علیؑ کی قسم آٹھوں میں مقرر چلیو۔" اس کا جواب جو میر صاحب نے دیا ہے وہ اگرچہ نہایت ہی دلچسپ ہے مگر ہم تطویل سے بچنے کے خیال سے اسے چھوڑے دیتے ہیں۔ انھوں نے دہلی و لکھنؤ کے موجودہ رنگ پر اعتراضات کیے ہیں اور معاصر شعرا پر نکتہ چینیاں کی ہیں جس سے ہمیں بحث نہیں۔ ہمیں صرف یہ بتانا ہے کہ اس زمانے میں شرفاء و کملاء درکنار، رنڈیاں تک لکھنؤ میں آ کے بستی جاتی

تھیں اور جو لوگ دہلی میں پھول والوں کی سیر کے رسیا تھے، اب کربلا اور آٹھوں کے میلے میں اپنا دل بہلاتے تھے۔

شمس العلماء مولانا آزاد مرحوم نے بعد کے تمام شعرائے دہلی اور لکھنؤ کو بلا لحاظ امتیاز وعہد ایک جگہ جمع کر کے اور زمانے کی طنابیں کھینچ کے پانچواں دور بنا دیا ہے۔ لیکن یہ ناانصافی ہے۔ اصلی پانچواں دور صرف ناسخ و آتش کا تھا جس میں زبان نے نئی وضع اختیار کی۔ بہت سے پرانے محاورات ترک ہو گئے۔ نئی بندشیں پیدا ہوئیں اور اس زبان کی بنا پڑی جو بعد کے شعرائے دہلی و لکھنؤ میں یکساں طور پر مقبول ہوئی اور قریب قریب وہ زبان بن گئی جو اب ہندوستان میں مستند ہے اور یہی وہ زمانہ تھا جب شاعری کی قلم رو میں پہلے پہل لکھنؤ کا سکہ جاری ہوا۔

اس کے بعد چھٹا دور وہ تھا جب لکھنؤ میں وزیر۔ صبا۔ رند۔ گویا۔ رشک۔ نسیم دہلوی۔ امیر۔ نواب مرزا شوق اور پنڈت دیا شنکر نسیم صاحبان مثنوی کی شاعری کا غلغلہ بلند تھا اور دہلی میں مومن۔ ذوق اور غالب نغمۂ شاعرانہ سنا رہے تھے۔ اس دور نے سچ یہ ہے کہ زبان کو بہ لحاظ خیالات سب سے زیادہ ترقی کے درجے پر پہنچا دیا۔

اس کے بعد ساتواں دور امیر۔ داغ۔ منیر۔ تسلیم۔ مجروح۔ جلال۔ لطافت۔ افضل اور حکیم وغیرہ کا تھا۔

ان آخری دوروں پر غائر نظر ڈالنے سے صاف نظر آ جاتا ہے کہ فصاحت زبان اور شاعری نے لکھنؤ میں کیسی مضبوط جگہ پکڑ لی تھی۔ چند ہی روز میں

شعر کہنا لکھنؤ میں ایک وضع داری بن گیا اور شعرا کی یہاں اس قدر کثرت ہو گئی کہ شاید کہیں کسی زبان میں نہ ہوئی ہوگی۔ عورتوں تک میں شعر و سخن کا چرچا ہوا اور جہلا کے کلام میں بھی شاعرانہ خیال آفرینیوں، تشبیہوں اور استعاروں کی جھلک نظر آنے لگی۔

فارسی شاعری کا اصلی اٹھان مثنوی سے ہوا ہے اور یہ صنف شاعری ہمیشہ سب سے زیادہ اہم اور باوقعت سمجھی گئی۔ ابتدا فردوسی کی رزمیہ مثنوی شاہنامے سے پڑی۔ پھر نظامی۔ سعدی۔ مولانائے روم۔ خسرو۔ جامی اور ہاتفی وغیرہ نے اس میں اعلیٰ ترین شہرت و ناموری حاصل کی۔ اردو میں میر تقی میر نے چھوٹی چھوٹی بہت سی مثنویاں دہلی و لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں لکھی تھیں مگر وہ اس قدر مختصر اور معمولی ہیں کہ مثنویوں کے تذکرے میں ان کا ذکر بھی بے محل سا معلوم ہوتا ہے۔

مثنوی لکھنے کا آغاز اردو میں میر ضاحک کے بیٹے میر غلام حسن حسن سے ہوا، جو بچپن ہی میں اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے تھے۔ یہیں کی صحبت میں ان کا نشو و نما ہوا تھا۔ یہیں پرورش پائی تھی اور یہیں کی آب و ہوا کے آغوش میں ان کی شاعری پلی تھی۔ کیوں کہ جس تعلیم اور جس سوسائٹی نے ان کی مثنوی "بے نظیر و بدر منیر" لکھوائی وہ خالص لکھنؤ کی تھی۔ اسی زمانے میں مرزا محمد تقی خاں ہوس نے مثنوی لیلیٰ مجنوں لکھی اور لکھنؤ میں مثنویت کا مذاق بڑھتا شروع ہوا۔ آتش و ناسخ کے زمانے میں تو ذرا خاموشی رہی۔ مگر پھر جو یہ مذاق ابھرا تو پنڈت دیا شنکر نسیم نے گلزار نسیم۔

آفتاب الدولہ قلق نے طلسم الفت۔ اور نواب مرزا شوق نے بہار عشق۔ زہر عشق اور فریب عشق لکھیں، اور انھیں اس قدر عام نمود و شہرت اور عالم گیر مقبولیت حاصل ہوئی کہ ہر ادنیٰ و اعلیٰ کی زبان پر ان مثنویوں کے اشعار چڑھ گئے۔ اس سے پیشتر کے زمانے میں کسی صاحب نے مثنوی میر حسن کے جواب میں لذتِ عشق نام کی ایک مثنوی لکھی تھی۔ وہ نواب مرزا شوق کی مثنویوں کے ساتھ شائع ہونے کی وجہ سے ان ہی کی جانب منسوب ہو گئی۔ لیکن حقیقت میں نہ وہ ان کی ہے اور نہ ان کے زمانے کی ہے۔

ان سب مثنویوں کو دیکھتے ہوئے مثنوی گل زار نسیم باوجود عام مقبولیت کے صدہا غلطیوں سے مملو ہے۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نازک خیال نو مشق ہے، جو ہر قسم کی شاعرانہ خوبیاں اپنے کلام میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ مگر قادر الکلامی کے نہ ہونے سے قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہے اور کسی جگہ اپنے مقصد کو حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کے جواب میں آغا علی شمس نے جو ایک بہت ہی کہنہ مشق شاعر تھے اسی بحر میں ایک مثنوی لکھی تھی جس میں غلطیوں سے پاک رہ کے تشبیہات، استعارات اور رعایت لفظی کے کمالات دکھائے تھے۔ مگر افسوس وہ مثنوی مٹ گئی اور گلزار نسیم کو جو شہرت حاصل ہو چکی تھی اس پر غالب نہ آ سکی۔ دہلی میں ان دنوں مومن خاں نے چند چھوٹی چھوٹی بے مثل مثنویاں لکھیں جو بہت ہی مقبول اور مشہور رہوئیں۔

مومن خاں کے مذاق شاعری میں نازک خیالی بڑھی ہوئی تھی۔ خیالی تشبیہوں اور استعاروں پر وہ اپنی سخن آفرینی کی عمارت قائم کرتے تھے۔

مثنویوں میں وہ زیادہ تو خیالی جذبات و صفات کو متشخص کر کے اپنے کلام میں ایک خاص لطف پیدا کیا کرتے تھے۔ مومن خاں کے ایک شاگرد نسیم دہلوی لکھنؤ میں آئے اور یہاں کے مشاعروں میں اپنا رنگ ایسا جمایا کہ بہت سے لوگ ان کے شاگرد ہو گئے۔ نسیم دہلوی نے لکھنؤ میں اپنے استاد کے رنگ کو خوب چمکایا اور ان کے شاگرد تسلیم لکھنوی نے اردو مثنویوں میں نظیری و عرفی و صائب کی خیال آرائیاں دکھا دیں اور نظم اردو میں جیتے جاگتے فیضی و غنیمت لا کے کھڑے کر دیے۔ ادھر آخر زمانے میں مولوی میر علی حید طباطبائی نظم لکھنوی نے شراب کی مذمت میں ساقی نامہ شفقیہ کے نام سے ایک ایسی بے نظیر اخلاقی نظم اردو پبلک کے سامنے پیش کر دی کہ اس کا جواب نہیں ہو سکتا۔ غرض کہ مومن خاں کی چند مختصر مثنویوں سے اگر قطع نظر کر لی جائے تو اردو مثنوی گوئی کا آغاز بھی لکھنؤ میں ہوا اور ترقی بھی یہیں ہوئی۔

بعض حضرات مثنوی میر حسن اور گل زار نسیم کے ذریعے سے دہلی اور لکھنؤ کی زبان کا مقابلہ و موازنہ کیا کرتے ہیں۔ جس خیال کو مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے اور زیادہ قوت دے دی۔ لیکن اول تو گل زار نسیم کو نظیر اکبرآبادی کے بنجارہ نامے کی طرح اگر شہرت ہو بھی گئی تو اسے مثنوی میر حسن کے مقابلے میں رکھنا اردو شاعری کی سخت تذلیل و توہین ہے۔ صحیح مقابلہ ہو سکتا ہے تو مثنوی میر حسن اور مثنوی طلسم الفت کا۔ اور اگر گل زار نسیم کی زبان زبردستی لکھنؤ کی زبان مان بھی لی جائے تو مثنوی میر حسن اور گل زار نسیم کا مقابلہ دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کا نہیں۔ بلکہ خود لکھنؤ کی اگلی پچھلی زبانوں کا مقابلہ

ہے۔ اس لئے کہ مثنوی میر حسن لکھنؤ کی پہلی زبان کا نمونہ ہے اور یہ آخری زبان کا۔

شاعری کی ایک اہم اور قدیم ترین صنف مرثیہ خوانی ہے۔ قدیم عربی شاعری میں زیادہ تر مرثیے اور رجز ہی شعر و سخن میں اظہار کمال کا ذریعہ تھے۔ فارسی میں مرثیہ خوانی کم زور پڑ گئی تھی۔ لیکن بہ عہد سلاطین صفویہ ایران میں مذہب شیعہ کو فروغ حاصل ہوا تو مصائب اہلبیتِ رسالتؐ کی یاد تازہ کرنے کے لئے شعرا کو مرثیہ خوانی کی طرف توجہ ہوئی۔ مولانا محتشم کاشی نے چند بندوں کا ایک بے مثل مرثیہ لکھا تھا جو عموماً مقبول ہوا۔ اس کے بعد سے رواج تھا کہ شعرا کبھی کبھی ماتم حسینؓ میں دو ایک مرثیے بھی موزوں کر دیا کرتے۔ لیکن شعر و سخن کی دنیا میں مرثیہ گوئی کی وقعت اس قدر کم تھی کہ مشہور تھا "بگڑا شاعر مرثیہ گو"

پھر جب مذہبی اعتبار سے دولت صفویہ مرحومہ کی جانشین اودھ کی سلطنت قرار پائی تو لکھنؤ میں مجالس کی ترقی و عزاداری کے جوش و خروش نے مرثیہ گوئی کی ایسی قدر دانی کی کہ اس فن کو غیر معمولی عروج حاصل ہونا شروع ہوا اور دراصل لکھنؤ کے عروج کا سارا راز اسی تاریخی واقعہ میں مستتر ہے۔ ہندوستان میں مغلوں کی سلطنت تھی جنہوں نے فارسی زبان کو درباری زبان قرار دیا اور فارسی معاشرت ان کی امیرانہ زندگی اور ان کے تمام کمالات کا مرکز تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہر ایرانی ہندوستان میں آتے ہی آنکھوں پر بٹھایا جاتا اور اس کی ہر حرکت اور ہر وضع مقبولیت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی۔ دہلی کی سلطنت میں بادشاہوں کا مذہب سُنی ہونے کی وجہ سے ایرانی اپنی بہت سی باتوں کو چھپاتے اور وہاں کی محفلوں میں اس قدر شگفتہ نہ ہونے پاتے جس قدر

کہ وہ اصل میں تھے۔ اودھ کا دربار شیعہ تھا اور یہاں کا خاندان حکمرانی خاص خراسان سے آیا تھا۔ اس لئے یہاں ایرانی بالکل کھل گئے اور اپنے اصلی رنگ میں نمایاں ہونے کی وجہ سے وہ جس قدر شگفتہ ہوئے اسی قدر زیادہ ہم مذہبی کے باعث یہاں کے اہل دربار نے ان کے اوضاع و اطوار کو حاصل کرنا شروع کیا اور ایرانیت جو در اصل ساسانی اور عباسی شان و شوکت کے آغوش میں پلی ہوئی تھی چند ہی روز کے اندر لکھنؤ کی معاشرت میں سرائت کر گئی۔

غرض سودا و میر کے زمانے میں میاں سکندر۔ گدا، مسکین اور افسردہ مرثیہ گو تھے جو چھوٹی چھوٹی نظمیں شہادت امام حسینؓ کے بیان میں تصنیف کر کے مجلسوں میں سنا دیا کرتے۔ ان کے بعد میر خلیق اور میر ضمیر نے مرثیہ گوئی کو بہت ترقی دی اور مرثیوں کی موجودہ وضع ان ہی کے زمانے میں ایجاد ہوئی۔ یہاں تک کہ زمانہ میر ضمیر کے شاگرد مرزا دبیر اور میر خلیق کے صاحب زادے میر انیس کو نام وری کے شہ نشین پر لایا اور ان دونوں بزرگوں نے مرثیہ خوانی میں ایسے ایسے کمالات شاعری دکھائے کہ شعر و سخن کے آسمان پر آفتاب و ماہ تاب بن کے چمکے۔ وہی مقابلہ جو میر و سودا اور آتش و ناسخ میں رہا تھا، اب میر انیس اور مرزا دبیر میں قائم ہوا۔ مرزا دبیر میں شوکت الفاظ تھی بلند خیالی اور علم و فضل کا زور تھا۔ میر انیس میں سادی بے تکلف اور جذبات انسانی پر حکومت کرنے والی زبان کی وہ خوبیاں تھیں جو سوا مبداء فیاض کی عنایت کے سیکھنے سے نہیں آسکتیں۔ ان دونوں بزرگوں نے فن مرثیہ گوئی کو شاعری کی اور تمام اصناف سے بڑھا دیا اور ادب اردو میں وہ نئی چیزیں

پیدا کر دیں جن کو انگریزی تعلیم کے اثر سے طبیعتیں ڈھونڈھنے لگی تھیں۔

انیسؔ و دبیرؔ نے مرثیہ گوئی کو اس درجۂ کمال پر پہنچا دیا تھا کہ اب مرثیہ گوئی بجائے معیوب ہونے کے سب سے بڑا شاعرانہ ہنر بن گئی تھی۔ تمام اہل لکھنؤ ان دونوں بزرگوں کے اس قدر معترف و مداح ہوئے کہ سارا شہر دو گروہوں میں بٹا ہوا تھا اور ہر سخن سنج یا انیسیا تھا یا دبیریا۔ اور ان دونوں گروہوں میں ہمیشہ باہمی مخالفت رہتی تھی۔

میر انیسؔ نے مرثیہ گوئی کے ساتھ مرثیہ خوانی کو بھی ایک فن بنا دیا۔ یونانیوں کے بعض مقرروں اور خطیبوں کی نسبت سنا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی تقریروں میں اثر پیدا کرنے کے لئے خاص خاص کوششیں کی تھیں اور آواز کے نشیب و فراز اور اوضاع و اطوار کے تغیرات سے گفتگو میں اثر پیدا کرتے تھے۔ اسلام کی اس طولانی عمر میں اس نہایت ضروری فن کو اصول کے ساتھ خاص میر انیسؔ نے زندہ کیا۔ الفاظ کے مناسب آواز کے تغیرات اور مضامین کے موافق چہرہ بنا لینے۔ کلام کو اعضاء و جوارح کے متناسب حرکات اور خط و خال کے اشارات سے قوت دینے کا فن خاص لکھنؤ کی اور وہ بھی میر انیسؔ کے گھرانے کی ایجاد ہے جس کی ترقی میں اب تک کوششیں جاری ہیں۔ اور ہمارے اسپیکر اپنی فصیح البیانی میں اثر پیدا کرنے کے لئے اگر ان باکمالوں کی شاگردی کریں تو نہایت ہی کامیاب اسپیکر ثابت ہوں۔

ڈراما کا فن سخن جو مغربی شاعری کی جان ہے اس سے عربی و فارسی کا ادب مطلقاً خالی تھا اور فارسی کی شاگردی کی وجہ سے اردو میں بھی اس کی طرف

کبھی توجہ نہیں کی گئی۔ سنسکرت میں اعلیٰ درجے کے ڈراما تھے۔ مگر ان سے ہندوستان کی آخری سوسائٹی بالکل ناآشنا ہو چکی تھی۔ رام چندر جی اور سری کرشن جی کے کارنامے البتہ ہندوؤں میں مذہبی آداب کے ساتھ دکھائے جاتے تھے۔ مگر اردو شاعری کو ان سے کسی قسم کا تعلق نہ تھا۔ رام چندر جی کے حالات انگلستان کے المپیا کی طرح کھلے میدانوں میں رزمیہ نقالیوں کی شان سے دکھائے جاتے اور سری کرشن جی کے حالات رقص و سرود اور موسیقی کے پیرائے میں مذہبی اسٹیجوں پر بعینہٖ اُپیرا کے طریقے سے نظر آتے جو "رہس" کہلاتے۔ واجد علی شاہ کو رہس سے خاص دلچسپی پیدا ہو گئی اور رہس کے پلاٹ سے ماخوذ کر کے انھوں نے اپنا ایک ڈراما تیار کیا جس میں وہ کنھیا جی بنتے یا عشق کے ستائے ہوئے جوگی بن کے دھونی رماتے اور بہت سی عورتیں، پریاں اور عاشق مزاج گوپیاں بن کے انھیں ڈھونڈھتی پھرتیں۔ پھر جب قیصر باغ کے میلوں کا دروازہ عوام الناس کے لئے بھی کھل گیا تو سارے شہر کے شوقینوں میں ڈراما کا فن خود بخود ترقی کرنے لگا اور چند ہی روز میں اس شوق کو اس قدر ترقی ہوئی کہ بعض مشہور شعرا بھی اس زمانے کے مذاق کے موافق طبع آزمائیاں کرنے اور ڈراما لکھنے لگے۔ چنانچہ واجد علی شاہ کے شوق کے ساتھ ہی میاں امانت نے جو ایک مشتاق شاعر تھے اندر سبھا لکھی اور موجودہ عہد کی کمپنیوں کی طرح شہر میں جا بجا مختلف جماعتیں ان کی "اندر سبھا" کو اسٹیج پر کھیلنے لگیں، جن میں کہیں عورتیں اور کہیں لڑکے ایکٹ کرتے۔ اس اندر سبھا میں اصول موسیقی کے مطابق دل کش دھنیں قائم کی

گئیں اور سارا شہر اندر سبھا کے جلسے دیکھنے کا مشتاق ہوا میاں امانت کی اندر سبھا کی کامیابیاں دیکھ کے اور لوگوں کو بھی شوق ہوا اور اس قسم کے بہت سے ڈرامے ایجاد ہو گئے سب کا نام "سبھا" قرار پا گیا چنانچہ شہر میں مداری لال وغیرہ کی بہت سی سبھائیں قائم ہو گئیں جن کے پلاٹ بدلے ہوئے تھے۔

سبھا کے نئے رنگ نے شہر میں ایسی زندہ دلی پیدا کر دی کہ سوا اندر سبھا کے لوگ کسی اور قسم کا ناچ گانا پسند ہی نہ کرتے تھے۔ ہر طرف سبھاؤں کی دھوم تھی اور اس کی بنیاد پڑ گئی کہ سوسائٹی کے مذاق کے مطابق اگلے عاشقانہ قصے نقل کے طور پر اچھی نظموں میں اور دل کش مضمون کے ساتھ پبلک کے سامنے پیش کئے جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ پارسی تھیٹروں نے اپنی انتظامی خوبیوں اور نمائشی دل فریبیوں کی وجہ سے سبھاؤں کا رنگ پھیکا کر دیا۔ لیکن یہ نہ سمجھو کہ ڈراما کا وہ پرانا مذاق جو لکھنؤ میں ایجاد ہو کے مروج ہوا تھا مٹ گیا۔ اول تو پارسیوں نے بھی اس چیز کو لکھنؤ سے لیا ہے۔ ان کا پہلا عام کھیل امانت کی اندر سبھا تھا اور باوجود اس کے لکھنؤ کے تمام قومی جلسوں میں آج تک سپیرے، ہریش چندر وغیرہ کے ایسے بیسیوں پر فارمنس ہو رہے ہیں اور اس مذاق کے ایکٹروں کا ایک مستقل گروہ پیدا ہو گیا ہے جو شرفا میں سے قومی مذاق اٹھ جانے پر بھی عوام کو محفوظ کرتا ہے۔ بہر تقدیر اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ اردو ڈراما کی بنیاد خاص لکھنؤ ہی میں پڑی اور یہیں سے سارے ہندوستان میں اس کا رواج ہوا۔

اردو شاعری کی ایک قسم واسوخت ہیں۔ یہ خاص قسم کے عاشقانہ مسدس ہوتے ہیں اور ان کا مضمون عموماً یہ ہوتا ہے کہ پہلے اپنے عشق کا اظہار، اس کے بعد معشوق کا سراپا، اس کی بے وفائیاں، پھر اس سے روٹھ کے اسے یہ باور کرانا کہ ہم کسی اور معشوق پر عاشق ہو گئے۔ اس فرضی معشوق کے حسن و جمال کی تعریف کر کے معشوق کو جلانا۔ چھیڑنا۔ جلی کٹی سنانا اور یوں اس کا غرور توڑ کے پھر ملاپ کر لینا۔ نظم اردو کی یہ قسم لکھنؤ ہی سے شروع ہوئی۔ زمانۂ وسط کے قریب قریب تمام شاعروں نے واسوخت لکھے ہیں اور ان میں بڑے بڑے لطف پیدا کئے ہیں۔ دہلی میں بھی بعد کے زمانے میں مختلف واسوخت لکھے گئے۔ خصوصاً مومن خاں نے کئی بہت اچھے واسوخت لکھے۔ مگر آغاز لکھنؤ ہی سے ہوا۔

امرا کی عیاشانہ طبیعتوں نے شاعری کی کئی اور صنفوں کو بھی پیدا کرایا جن کا آغاز دہلی ہی سے ہوا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ مہمل ہزل گوئی ہے اور کسی قدر پر لطف ریختی ہے۔ ہزل گوئی کا آغاز دہلی میں جعفر زٹلی سے ہوا جو غالباً محمد شاہ کے زمانے میں تھے۔ ان کے کلام کو میں نے اول سے آخر تک دیکھا ہے۔ سوا فحش گوئی اور حد سے گذری ہوئی بے حیائی کے نہ کوئی شاعرانہ خوبی نظر آتی ہے اور نہ زبان کا کوئی لطف ہے۔ اس کے بعد دہلی ہی کی خاک سے صاحب قراںؔ تخلص بلگرام کے ایک ہزل گو لکھنؤ میں آئے اور یہیں چمکے۔ ان کا نام سید امام علی تھا اور آصف الدولہ کے زمانے میں وارد لکھنؤ ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ لکھنو کے متبذل مذاق والے رئیس

زادوں میں ان کا نشو و نما ہوا۔ ان کا دیوان ملتا ہے اور گو کہ کلام فحش اور تہذیب سے کوسوں دور ہے مگر پھر بھی اس میں ایک بات ہے۔ شاعرانہ خوبیوں کے ساتھ زبان اور محاوروں کا پورا لطف ہے۔ لیکن اس فن کو لکھنؤ کے آخری دور میں میاں مشیر نے جو مرزا دبیر کے شاگرد تھے کمال کے درجے کو پہنچا دیا۔

مجھے اس موقع پر بلا لحاظ اس کے کہ شیعوں اور سنیوں کے متعصبانہ جذبات کا لحاظ کروں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ لکھنؤ میں جب شیعہ سلطنت قائم ہوئی تو شیعیت نے اپنے اصلی رنگ کو قائم رکھ کے کمال آزادی کے ساتھ اپنے ہر اصول میں ترقی شروع کی۔ مذہب شیعہ کی بنیاد دو چیزوں پر ہے۔ ایک تولا یعنی اہلبیت کرامؑ اور خاندان نبوت کے ساتھ اظہار محبت اور دوسرا تبرا یعنی اس خاندان محترم کے دشمنوں سے اپنی برأت ظاہر کرنا، جس نے باہمی رقابت و تعصب کے بڑھنے سے سب و شتم کی صورت اختیار کر لی۔ اصولاً اس عقیدے میں سُنی بھی ان کے ساتھ شریک ہیں مگر فرق یہ آپڑا کہ پہلے تینوں جانشینانِ رسالت کو اہل سنت افضل الناس بعد انبیاء و رسل اور سچے جانشینان رسالت مانتے ہیں اور شیعہ ان کو غاصب و ظالم بتاتے ہیں اور جب یہ بزرگ بھی ان کے عقائد میں خاندان رسالت کے دشمن قرار پائے تو ان سے بھی تبرا واجب ہو گیا جس کو مہذب اور صاحب علم لوگوں نے اگر حرف برأت کے صحیح معنوں کی حد تک رکھا تو عوام شیعہ اپنے مذاق کے مطابق ان پر زبان سب و شتم دراز کرنے لگے اور یہی چیز سنی شیعوں کے باہمی تعصب کی بنا قرار پا گئی۔

ان دونوں مذہبی چیزوں نے لکھنؤ کی شاعری پر نہایت ہی عمدہ اور مناسب اثر ڈالا۔ تو آئیے مرثیہ گوئی کے فن کو اپنے آغوش میں لے کے جملہ اصنافِ شاعری سے بڑھا دیا تو دشمنانِ خاندانِ نبوت سے تبرا کرنے کے جوش نے پرانی ہجوگوئی کو اختیار کر کے اسے ہرزیہ گوئی کے نام سے ترقی دی۔ اس فن کے متعدد باکمال لکھنؤ میں مشہور ہوئے مگر افسوس یہ چیز بالتخصیص اہلِ سنت کو ناگوار گذرنے والی تھی۔ عہدِ شاہی میں اس پہ تلواریں نکل پڑا کرتی تھیں اور انگریزی میں بھی آج تک کبھی کبھی فوجداریاں اور مقدمہ بازیاں ہو جایا کرتی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہرزیہ گوئی و ہرزیہ خوانی کو مکانوں کی چار دیواری سے باہر نکلنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ اگر ہرزیہ گوئی کا عام سبجکٹ ایسا محدود اور مابہ النزاع نہ ہوتا تو زمانہ دیکھتا کہ لکھنؤ کے ہرزیہ گویوں نے اپنی بیہودہ گوئیوں اور فحاشیوں میں بھی کیسے کیسے کمال دکھائے ہیں۔

اس فن میں سب سے زیادہ شہرت مرزا دبیر کے شاگرد میاں مشیر کو حاصل ہوئی۔ ہجوگوئی اور فحاشی پہلے بھی تھی۔ مگر میاں مشیر نے جس قسم کے محاورات سے کام لیا، بندشِ الفاظ، طرزِ ادا اور استعمالِ تشبیہات میں جیسے مضحکہ خیزی پیدا کی اور صحبت کو مارے ہنسی کے لٹا دینے اور سامعین کے پیٹ میں بل ڈال دینے کے لئے جو زبان اور جیسا اسلوبِ سخن اختیار کیا اس کی خوبیاں اور جدتیں بیان سے باہر ہیں۔ ابتذال میں بھی لطف پیدا کر کے اسے شائستہ لوگوں کے سامنے پیش کرنے کے قابل بنا دینا ان کا خاص جوہر تھا جو ان سے پہلے اور ان کے بعد کسی کو نہیں نصیب ہوا۔

ہزل گوئی ہی کے سلسلے میں میاں چرکین کا نام بھی لینا چاہیے۔ لکھنؤ کے زمانۂ وسطیٰ میں عاشور علی خاں نام کے ایک زندہ دل اور نہایت ہی قابل و با مذاق رئیس تھے۔ ان کے وہاں کی صحبت اس وقت کی سوسائٹی کا ایک اکمل ترین نمونہ تھی۔ ان ہی نے جان صاحب اور چرکین کو پیدا کیا، اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان ہی کی صحبت میں صاحب قراں کا بھی نشو و نما ہوا تھا۔ چرکین اپنے ہر شعر میں پیشاب پیخانے کی رعایت رکھتے اور ان کے اشعار سے ایسی تعفن آتی ہے کہ نام سنتے ہی ہمارے ناظرین کے دماغ سڑ گئے ہوں گے۔ مگر چونکہ ان کو ایک قسم کی خصوصیت تھی، ہم نے ان کا ذکر کر دیا۔ ان کے کلام میں بعض شاعرانہ خوبیاں اور اچھی تشبیہیں بھی ہیں مگر ان کی مذاق نے ان خوبیوں کو بھی گندہ اور پلید کر دیا ہے۔

لیکن ریختی کا فن باوجود غیر مہذب ہونے کے دلچسپ ہے اور چرکین کی شاعری کی طرح اذیت رساں نہیں۔ مردوں اور عورتوں کے محاوروں اور لہجے میں تھوڑا بہت فرق ہر زبان میں ہوا کرتا ہے، مگر اتنا نہیں جتنا ہمیں اپنی زبان میں نظر آتا ہے۔ فارسی عربی سب زبانوں میں یہ امتیاز موجود ہے۔ مگر اردو اس خصوصیت میں بڑھی ہوئی ہے۔ فارسی اور عربی کا پرانا مذاق تھا کہ عورتیں شعر کہتیں تو اپنی زبان میں کہتیں اور مرد کبھی عورتوں کی زبان سے کوئی خیال ادا کرتے ہیں تو زبان میں لطف پیدا کرنے کے لئے ان کی زبان اختیار کر لیتے۔ یہی حال انگریزی کا ہے۔ اردو شاعری ہمیشہ سے صرف مردوں کی زبان میں رہی۔ یہاں تک کہ اس میں عورتیں کہتی بھی ہیں۔

تو مرد بن کے کہتی ہیں۔ مردوں ہی کی زبان اختیار کرتی ہیں اور اپنے لئے
ضمیریں تک مذکر استعمال کرتی ہیں۔ اگر شاعر کا نام نہ معلوم ہو تو کوئی نہیں
پہچان سکتا کہ یہ کسی مرد کا کلام ہے یا عورت کا۔

اردو شاعری کا تیسرا یا چوتھا ہی دور تھا کہ شوخ طبع جوانوں میں خیال
پیدا ہوا کہ ریختہ کی طرح ایک ریختی ایجاد کی جائے۔ میر حسنؔ نے اپنی مثنوی
میں ضرورت کے موقعوں پر یہ زبان موزوں کی تھی۔ مگر وہاں تک مضائقہ
نہ تھا۔ میاں رنگینؔ نے اس رنگ کو مستقل طور پر اختیار کیا جو دہلی کے رہنے
والے تھے اور لکھنؤ کی صحبتوں میں شریک رہا کرتے تھے۔ ابتداً مہذب لوگوں
کی صحبت نے اس رنگ کو بے شرمی اور خلاف تہذیب جانا۔ چنانچہ سید انشاؔ
کی زبانی ہم نے لکھنؤ میں دہلی کے جن مہذب سن رسیدہ بزرگ اور وہیں
کی ایک رنڈی نورا کی گفتگو لکھی ہے اس میں وہ بزرگ فرماتے ہیں "اور سب
سے زیادہ ایک اور سنئے کہ سعادت یار طہماسپ کا بیٹا انوری ریختہ اپنے کو جانتا
ہے۔ رنگینؔ تخلص ہے۔ ایک قصہ کہا ہے۔ اس مثنوی کا نام دل پذیر رکھا
ہے۔ رنڈیوں کی بولی اس میں باندھی ہے۔ میر حسنؔ پر زہر کھایا ہے، ہر چند
اس مرحوم کو بھی کچھ شعور نہ تھا۔ بدر منیر کی مثنوی نہیں کہی گویا سانڈے کا
تیل بیچتے ہیں۔ بھلا اس کو شعر کیوں کر کہیے؟ سارے لوگ دلی کے لکھنؤ
کے رنڈی سے لے کے مرد تک پڑھتے ہیں ؎

چلی واں سے دامن اٹھاتی ہوئی | کڑے سے کڑے کو بجاتی ہوئی

سو اس بے چارے رنگینؔ نے بھی اسی طور پر قصہ کہا ہے۔ کوئی

پوچھے کہ بھائی تیرا باپ رسالدار مسلم، لیکن بے چارہ برچھی بھالے کا ہلانے والا، تیغے کا چلانے والا تھا تو ایسا قابل کہاں سے ہوا؟ اور شہد پن مزاج میں رنڈی بازی سے آگیا ہے تو ریختہ کے تئیں چھوڑ کر ایک ریختی ایجاد کی ہے۔ اس واسطے کہ بھلے آدمی کی بہو بیٹیاں پڑھ کر مشتاق ہوں اور ان کے ساتھ اپنا منہ کالا کرے۔ بھلا یہ کلام کیا ہے؟ ؎

ذرا گھر کو رنگیںؔ کے تحقیق کر لو یہاں سے ہے کے پیسے ڈولی کہارو

مرد ہو کر کہتا ہے۔ ع

''کہیں ایسا نہ ہو کم بخت میں ماری جاؤں''

اور ایک کتاب بنائی ہے اس میں رنڈیوں کی بولی لکھی ہے جس میں اوپر والیاں چلیں۔ اوپر والا چاند، اجلی دھوبن وغیرہ وغیرہ ہیں۔''

مگر مہذب بڈھے شکایت کرتے کرتے مر گئے۔ نوجوانوں کی رنگینی نے رنگینؔ کے مذاق کو ترقی دے ہی کے چھوڑا اور ریختی اردو کا ایک فن ہو گیا۔ جس کی ایجاد گو ایک دہلی ہی کے شاعر سے ہوئی تھی مگر لکھنؤ میں ہوئی اور وہیں اسے فروغ ہوا۔ قصے کے سلسلے میں اس زبان کو میر حسنؔ کے بعد نواب مرزا شوقؔ نے جس اعلیٰ درجۂ کمال کو پہنچا دیا تعریف نہیں ہو سکتی۔ صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جائیے، یہی نہیں پتہ چلتا کہ موزوں کرنے میں شاعرانہ ضرورتوں نے بولنے کی زبان پر کہیں کچھ تصرف بھی کیا ہے یا نہیں۔ لیکن غزل گوئی میں رنگینؔ کی جانشینی جان صاحب نے کی جو لکھنؤ کے ایک معمولی شخص تھے اور عاشور علی خاں کی خرادپر چڑھ کے تیار ہوئے تھے۔ گو کہ جان صاحب

کے بعد اور ریختی گو بھی لکھنؤ میں پیدا ہوئے مگر جان صاحب پر کمال اور شہرت کا خاتمہ ہو گیا۔ انہوں نے غزلیں کہیں واسوختی کہی اور بھی کئی نظمیں کہیں۔

ریختی میں اگر فحش اور بدکاری کے مذاق سے پرہیز کر کے پاک دامنی کے جذبات اختیار کئے جاتے تو یہ فن ایک حد تک قابل ترقی ہوتا۔ مگر خرابی یہ ہوئی کہ اس کی بنیاد ہی بدکاری کے جذبات اور بے عصمتی کے خیالات پر تھی۔ اس لئے ریختی گویوں کا قدم ہمیشہ جادۂ تہذیب و اعتدال سے باہر ہو گیا اور اس سے زبان کو چاہے کسی حد تک فائدہ ہوا ہو مگر اخلاق کو نقصان پہنچا۔

اونٹ

یہ سبق سرشار کے مشہور ناول' فسانہ آزاد سے ' انتخاب کیا گیا ہے۔
یہ ایک تقریر ہے جو اس فسانہ کے ہیرو میاں آزاد نے اس جانور کی تعریف میں اپنے مخصوص ظریفانہ رنگ میں کی ہے۔

صورت واہ جی واہ! سیرت سبحان اللہ! قطع دنیا سے نرالی طبیعت نہایت عالی۔ جانور کیا جانوروں کا قبلہ گاہ ہے اور حق یوں ہے کہ رہ نوردانِ دشت عرب کا یہی پشت وپناہ ہے۔ بے تکا پن قطع ہی سے ظاہر ہے۔ گردن شیطان کی آنت یا طول امل۔ مگر دُم میں نمدا۔ خاصہ لنڈورا۔ اور بلبلانا ماشاء اللہ کتنا موزوں ہے۔ گویا ارگن باجا بجا رہے ہیں۔ اور سنئے کہ یہ حضرت بڑے جغادری ہیں۔ اس سے پُرانا جانور ہی نہیں۔ ساری خدائی کی خاک چھانئے مگر کھلا مشعل آفتاب لے کر ایسا پُرانا جانور کہیں سے ڈھونڈھ لائیے۔ جب ہی تو ہم نے ان کو جانوروں کا قبلہ گاہ کہا۔ ہماچل پہاڑ کی چوٹی پر جو علما نے تحقیقات کی اور پہاڑ کھودا تو اونٹ کی ہڈیاں پائیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اونٹ کا یہ مقولہ صحیح ہے ؎

من آں وقت بودم کہ آدم نہ بود کہ آدم عدم بود وحوّا نہ بود

اور لطیفہ سنئے کہ جنگل سے حضرت ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ، حضرتِ انسان کے پکّے خیر خواہ ہیں۔ جنگل میں نام نہیں

غیر آباد مقام سے ان کو کام نہیں۔ جب دیکھئے ہماری آپ کی خدمت کے لئے تیار۔ ناک میں نکیل پڑی ہوئی، کمر پر بوجھ لادے ریگستان، میدان، بیابان میں گردن اٹھائے بلبلاتے چلے جاتے ہیں۔ اور طرہ یہ کہ جھٹکیّا ہی کھاتے ہیں۔ سادگی جو مزاج میں سمائی تو اغذیہ نفیس و لذیذ سے نفرت ہو گئی۔

تارک اللحم بھی حد سے سوا۔ گوشت کا چھونا قسم ہے۔ ہاں کانٹوں پر عاشق ہیں۔ اس میں کسی کا اجارہ نہیں۔ اِملی کی پتّی پر بھی لوٹ ہیں۔ اب بعض علما نے تحقیقات کی ہے کہ دنیا میں ایک ایسا مقام ہے جہاں اونٹ جنگلوں میں رہتے ہیں، ورنہ اب تک سب کو شک کی جگہ یقین تھا کہ اونٹ پالو ہی جانور ہے۔ جنگل سے اس کو کوئی واسطہ ہی نہیں۔ دُور کیوں جائیے۔ امریکہ اور اسٹریلیا میں کیوں ٹھوکریں کھائیے، ترکستان اور شمالی چین ہی کے جنگلوں میں ان سے نہ مصافحہ کر لیجئے۔ اب سنئے کہ جنگلی اونٹ پالو کی نسبت زیادہ خاکی رنگ کا ہوتا ہے۔ لیکن ناک کے پاس زرد اور دیکھو سلیم الطبع، حلیم المزاج اتنے بڑے کہ جب چاہئے جنگل سے پکڑ لائیے۔ ہاں ذرا شتر غمزے تو دکھائیں گے۔ مگر جھپ سے دم میں آجائیں گے بے چون و چرا۔ شر تو مزاج میں چھو ہی نہیں گیا۔ حضرت انسان کو اپنے حلوے مانڈے سے مطلب، پکڑا اور چھری تیز کی اور گوشت خوب چھک کر چکھ گئے۔ مگر یاں کوئی جنگل کا اونٹ پکڑ لینا دل لگی نہیں ہے اور اگر پھنس بھی گیا تو پالنا بہت محال ہے۔ وحشت عمر بھر جاتی ہی نہیں، گئے

کی دم ہے! جنگلی اونٹ ہوا سے باتیں کرتا ہے۔ گھوڑے کو سانڈنی کی دم میں باندھ دو یہ کیسا ہی تیز رفتار صرصر تک کیوں نہ ہو، اس کے غبار کو تو پہنچ نہیں سکتا۔ جنگلی سانڈنی کی آواز نازک ہوتی ہے۔ بلبلانے میں معشوق پن کا انداز، کہیں ایسا نہ ہو کہ بعض بے تکے شاعر اپنے معشوق کی آواز کو سانڈنی کی نازک آواز سے تشبیہ دے دیں۔ ہر سال بچہ جنے، ممکن کیا کہ کسی سال ناغہ ہونے پائے۔ کبھی کبھی توام بچے بھی جن پڑتی ہے۔

عموماً ایک جنگلی کا گوشت پالو کے گوشت سے شیریں اور خوش ذائقہ ہوتا ہے۔ جھیل، تالاب، نالے پر بیشتر گھوما کرتے ہیں۔ لوگوں کی یہ بھی دل لگی ہے کہ شکار کیا اور نوش جان فرمایا اور کھال دو ڈھائی روپے کو بیچ ڈالی۔ نظر منزلوں کی خبر لائے۔ گدھ شرمائے۔ قوت شامہ ایسی تیز کہ کتا بھی مان جائے اور کان تو بلا کے پائے ہیں ذرا پتّا کھڑکا اور اونٹ سرکا۔

نام بھی حضرت کے مختلف ہیں۔ اونٹ۔ شتر۔ بعیر۔ کیمل۔ سانڈنی اوٹونا اور عرب کے لغات میں تو شاید ہی کوئی ایسا لفظ ہوگا جس میں ان کا ساجھا نہ ہو۔ بھئی جا ہے کوئی اس کو بنائے، چاہے اس کی سج دھج پر قہقہہ اڑائے، اس میں شک نہیں کہ ریگستان کے لئے تو یہ بادشاہ ہے۔ چھینٹوں کا پانی ایک دفعہ میں سٹرک لیتا ہے۔ پیٹ ہے یا بحراوقیانوس!

آٹھوں کا میلہ

(سرشار کی سب سے مشہور تصنیف اُن کا "فسانۂ آزاد" ہے۔ اس کتاب میں شروع سے آخر تک لکھنؤ کی سوسائٹی کے مختلف مرقعے اس طرح پیش کئے گئے ہیں کہ فسانۂ آزاد کا ہیرو آزاد ہر جگہ جاتا ہے اور ان چیزوں کو دیکھ کر جو اثر قبول کرتا ہے اُس کا بیان مصنّف نے کر دیا ہے' آٹھوں کا میلہ' اِسی کتاب کا ایک حصّہ ہے)

وہاں سے جو میاں آزاد تیر کی طرح رواں ہوئے تو راہ میں دیکھا کہ کئی مسافر لدے پھندے جا رہے ہیں۔ کیوں بھئی اِس وقت کہاں؟ لکھنؤ۔ لکھنؤ۔ یہ کیوں؟ کیوں کیا! آٹھوں کا میلہ ہے یا نہیں؟ اس دھوم دھڑکے کا میلہ دیکھا نہ سُنا۔ ہاں! تو اب ہم بھی چلتے ہیں۔ محرم الحرام اور بہار بسنت کے تو خوب مزے اُٹھائے اب چلئے یہ میلہ بھی دیکھ لیں۔ کیا جانے پھر یا قسمت چھوٹے گھوڑا اچھوٹے۔ یہ کہہ کر میاں آزاد بھی لکھنؤ چلے۔ نور کے تڑکے داخل۔ سُبحان اللہ کیا صبح ہے۔ عارفانِ حق پرست کے دل کی طرح نورانی اور باطن میں اہلِ تصوّف کے مثل مہبطِ فیضِ ربّانی۔ جدھر دیکھو تجلّی اور نور جدھر جاؤ لطف اور سرور۔ سلطانِ خاوری کے تاجِ زرّیں کی چمک اور اشعۂ زرنگار سے ذرّوں کی جھلک نمودار۔ در و دیوار سے آیۂ وجعلنا الشمس ضیاء آشکار۔ شنبہ کا دن جس کی شان میں فصحا نے کہا ہے (کہ مکتب خانہ ہمارا

روز بازار از دستِ اطفالِ دبستان سبق آموز او۔ الف ابجد زبان است و نقطۂ اولین پرکارِ دوراں) دیکھتے کیا ہیں کہ صبح ہی سے میلے کا رنگ جما ہے۔ نخل بہار کی نشو ونما ہے۔ غٹ کے غٹ ٹھٹ کے ٹھٹ۔ شہدے۔ لفنگے۔ لُورے لُچے۔ گرہ کٹ۔ جیب کترے۔ چرسیے۔ مدکیے۔ گنجڑیے۔ بھنگڑیے۔ شریف و نجیب۔ زیرک و لبیب سب جوق جوق اُمنڈے آتے ہیں، تا مدان ہوادار۔ رہوار باد رفتار۔ فنس زرنگار۔ ٹٹو۔ گھوڑا اسب خراماں خراماں پو قدمے آتے ہیں۔ بگھی پر بگھی ٹوٹی پڑتی ہے۔ گاڑی سے گاڑی لڑتی ہے۔ رنگیلوں چھیل چھبیلوں کی بن آئی۔ گاڑھی بوٹی چڑھائی۔ بن ٹھن کے چھیلا بن کے میلہ دیکھنے چلے۔ بالوں میں حنا کے تیل چھوڑے۔ کیچل لسبٹ کا دوعانی رومال اوڑھے، دو انگل مانگ کھولے۔ بانڈری تورے۔ پٹیاں جمائے گھڑی لگائے۔ ڈاڑھی چڑھائے گلے میں گلوبند۔ شربتی کا انگرکھا تن کا زیب۔ پاؤں میں مخملی جوتی۔ کاشانی یا سوتی۔ قہقہے اُڑاتے آنکھ لڑاتے جا رہے ہیں۔ اِدھر اُدھر نظارہ بازی کر کے مسکرا رہے ہیں۔ فنس پر ماہرو ٹھسّے سے بیٹھی ہیں مگر بند ہٹو بچو کا شور بلند۔ ساقنوں کا بازار گرم، کسی نے دو کش پیے ڈٹکا ہتھیایا۔ ساقنوں کی دوکانیں دھواں دھار۔ تنبولیوں کے بیڑے مزے دار۔ کان میلئے کی سرگوشی۔ حجام کی رونمائی۔ برف والے کی سرد مہری۔ سنسکرنوں کی ہانک۔ آنب کے مجے کی کمرکھ ہیں۔ کابل کا میوہ رس بھری تاجے گلابیاں۔ شہتوت۔ بوٹ لو، ہرے بھرے بوٹ۔ کسی طرف سرمہ مِسّی شیشہ کنگھی دیا سلائی کی ڈبیا ہے۔ بخشی بھولا ناتھ

کا باغ میلے کا چشم و چراغ ہے۔ ٹکیت رائے کا تالاب ہزاروں میں انتخاب لاکھوں میں لاجواب ہے۔ جو سلسبیل و کوثر کو شرمائے۔ نسیم دیکھے تو پانی پانی ہو جائے۔ عجیب لطف و سماں ہے، ہزار ہا تماشائی تالاب کے ارد گرد بستر جمائے کوئی دری کوئی زین پوش بچھائے بیٹھا میلہ دیکھ رہا ہے۔ کوئی جہانیاں جہاں گشت چکر لگا رہا ہے۔ کوئی ہوا کھاتا ہے۔ ایک فنس پر ایک جوانِ رعنا ڈھوہ کا ڈھوہ پچیس برس کا سن چلنے پھرنے کے دن لدا ہوا جا رہا ہے۔ کوئی ٹٹو کو ٹخ ٹخ کرتا آ رہا ہے۔ اُمرا کے لڑکے زیور سے گوندنی کی طرح لدے مٹھائی خریدنے میں مصروف ہیں مگر خدمت گار دیکھ بھال رہا ہے کہ کوئی دست چالاک ہاتھوں ہاتھ پاؤں کے گھونگھرو نہ اُڑا لے۔ عورتیں الگ زیور سے منجلی گھونگھٹ کاڑھے دبکی چلی جاتی ہیں کہ کوئی چوہے دنتیاں نہ موس لے جائے۔ تخت رواں آتے ہیں، سوانگ کرتب دکھاتے ہیں۔ شعبدہ باز سوانگ لاتے ہیں۔ کوئی دہکتا انگارا کھا گیا۔ کوئی لوہے کے چنے کر کر کے چبا گیا۔ برہمن ڈول لئے گشت لگاتے ہیں، سقے اور بھشتی کٹورے کھنکھناتے ہیں، سہ پہر تک خوب جمگھٹا رہا۔ چراغ روشن ہوئے اور یار لوگ کھسکے۔ کسی نے مٹی کا ببوا لیا۔ کسی نے روئی کا لنگور اتنے میں ایک ریلا آیا تو کھلونے چکنا چور۔ ایک نے غل مچایا کہ وہ ہاتھی آیا، بھیڑ چھٹ گئی اور ڈراتے ہوئے چلے گئے۔ مگر بگڑے دل اپنی جگہ سے نہ ٹلے، شربتی انگرکھا چاہے ان گاؤ زوریوں میں چر سے نکل جائے۔ مگر ممکن کیا کہ بل جائے

اس بھیڑ بھاڑ میں پولیس کا انتظام خوب رہا۔ چوٹّے اُچکّے جاکر پچھتائے۔ بھلے مانس مزے سے گھر آئے۔

رنگے سیار

اب اس فرح بخش و دل کشا مقام ندرت القیام کا ذکر سنئے۔ چوطرفہ
کھائی کھاری ہوئی ہے، آٹھ آٹھ گز گہری۔ سرپٹ اردگرد بوئی ہے۔ ایسی
گھنی کہ چڑیا تک کا گذر نہ ہو سکے اور وہ تیز کہ تلوار گرد۔ بڑا عالی شان محراب
دار پھاٹک لگا ہوا ہے۔ وہ جوہر دار شیشم کی لکڑی کہ باید و شاید۔ کیاریاں
روز سینچی جاتی ہیں۔ روشوں پر سُرخی کٹی ہے۔ اشجار پر بہار گویا آسمان سے
باتیں کرتے ہیں۔ کہیں انار کی قطار۔ کہیں لکھوٹ کی بہار۔ ادھر انبہ لذیذ
و شیریں۔ ادھر ہاتھی چنگھاڑ۔ اور وہ حلوائے بے دود۔ چکوتروں اور مہتابیوں
سے ٹہنیاں پھٹی پڑتی ہیں۔ نارنگی اور چکوترا میٹھے شاخوں پر لدے ہیں۔ پھولوں
کی بوباس۔ کہیں گل مہندی کہیں گل عباس۔ نواڑی پھولی ہوئی۔ چوطرفہ
عالم نور ہے۔ ہر سمت لطف موفور ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، اودی اودی
گھٹا، کلیوں کی چٹک، جوہی کی بھینی بھینی مہک۔ کلغے کی دھک، کنیل کی
دمک۔ وسط باغ میں ایک تین فٹ کا اونچا پکا مربع چبوترہ بنا ہے اور
ایک کونے میں چھوٹا سا خوش نما بنگلہ ہے۔ اغل بغل دو ایک صاف ستھری
کوٹھریاں۔ یہ تو سب کچھ ہے مگر مکین کا پتہ نہیں۔ اس سیم تن کی چال
ڈھال اور طرز نشست سے اجنبیت برستی تھی۔ حیرت تھی کہ اس باغ

لطافت بار کے مکین سلیقہ شعار کہاں چھپ رہے ہے۔

باغ ہے پُر عجب ہے یہ روداد	نہ کہیں آدمی نہ آدم زاد
گل ہیں سب اپنے اپنے جوبن پر	بوئے گل ہے صبا کی توسن پر
ہے عجب لطف پر شگوفہ و گُل	کہیں شبو کھلی کہیں سنبل

انھوں نے دیکھا کہ بتِ طناز سرمایۂ ناز آفتابہ کو زمین پر ٹپک کر ایک نواڑ کی نازک پلنگڑی پر سو رہی ہے۔ اب تو ان کو خوب ہی موقع ملا۔ اٹھے اور میوۂ تر جس قدر جی چاہا خوب چمک کر کھایا اور آفتابہ کو منہ سے لگایا تو ایک ایک قطرہ پی گئے۔ پیٹ بھرا تو دور کی سوجھی۔ جان پر کھیل کر کف پائے نگاریں کا بوسہ لے ہی لیا۔

تو بہ خواب ناز بودی کہ من از رقیب پنہاں
کف پات بوسہ دادم زحنا شنیدہ باشی

اتنے ہیں پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ میاں آزاد جھٹ انگور کی ٹٹی میں چھپ رہے، مگر ناک لگائے بیٹھے ہیں کہ دیکھیں ہے کون۔ دیکھا تو پھاٹک کی جانب سے کوئی آہستہ آہستہ آرہا ہے۔ قریب آیا تو انھوں نے بہ غور نظر ڈالی۔ ایک کشیدہ قامت، لحیم و شحیم ڈنڈپیل، چٹ لنگوٹ باندھے اکڑتا اینڈتا اس بنگلے کی طرف جاتا ہے۔ سمجھے کہ کوئی پہلوان کشتی گیر اپنے اکھاڑے سے واپس آتا ہے۔ قریب آیا تو یہ گمان دور ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ کوئی شاہ جی ہیں۔ وہ چٹ لنگوٹ جس سے پہلوان کا دھوکا ہوا تھا تہ بند نکلا۔ شاہ صاحب سیدھے بنگلے میں داخل ہوئے۔ سیم تن کو

پلنگڑی پر سوتا پایا۔ ایک دفعہ ہی پلنگ پر ہاتھ مار کر چلا اٹھے (اٹھ حکم معبود) وہ زنِ رعنا شمائل گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اٹھتے ہی قدم لئے۔ شاہ جی نے فرط شفقت سے اس کی جبیں نورانی اور جبین پیشانی پر بوسہ دیا اور ایک تپائی پر بیٹھ کر یوں تقریر کرنے لگے۔

شاہ جی۔ بیٹی آج تم کو ہمارے سبب بہت راہ دیکھنی پڑی۔ ایک گانوں میں یہاں سے دس کوس پر راجہ رہتا ہے۔ مگر اسی برس کا ہو گیا اللہ نے اسے لڑکا دیا نہ لڑکی۔ ایک دن مجھے بلوایا میں کہیں کو آتا جاتا تو ہوں نہیں۔ وہ رانی کو لے کر آپ آیا قدم بوسی پر گر پڑا میں نے رانی کے سر پر ایک گلاب کا پھول بن سونگھا دے مارا۔ پانچویں ہی مہینے اللہ نے لڑکا دیا راجہ میرے پاس دوڑا آتا تھا کہ میں راہ میں ملا۔ دیکھتے ہی مجھے رتھ پر بٹھا لیا۔ کہتا ہے روپیہ لو۔ جاگیر لو۔ گانوں لو۔ ہاتھی گھوڑے لو۔ مگر میں کب مانتا ہوں۔ اس وقت پیچھا چھوٹا۔ تم پانی لائی ہو گی تو میں پھونک دوں گا، جس میں تم نامحروم نہ رہو۔

سیم تن۔ میں آپ کی لونڈی ہوں یہی کیا کم ہے کہ آپ کی زیارت نصیب ہوئی۔ آفتابہ پانی کا بھرا ہوا وہ رکھا ہے۔ آپ پھونک ڈال دیں تو میں رخصت ہوں۔ یہ کہہ کر سیم تن اٹھی، دیکھا تو آفتابہ موجود مگر پانی ندارد۔ ایں یہ پانی کیا ہوا؟ زمین کھا گئی، آسمان کھا گیا۔ ابھی پانی رکھا، دیکھتے ہی دیکھتے اڑ گیا۔ ہے ہے شاہ صاحب آپ کے پاس میں جھوٹی بنی۔ میری تجری کرکری ہوئی۔ زمین پھٹ جائے تو میں دھنس جاؤں۔ اے لو غضب

خدا کا ایک بوند تک نہیں۔ اللہ جانتا ہے لبالب بھرا ہوا تھا۔

شاہ جی۔ بتا ہی دوں اچھا اب بے چین نہ رہو۔ سنو سنو۔ مجھے اشراق سے معلوم ہو گیا کہ تم آتی ہو۔ جب تم سو رہیں تو میں نے آنکھ بند کی اور یہاں پہنچ گیا۔ پانی پیا۔ پھر آنکھ بند کی اور راجہ کے پاس ہو رہا۔ پھونک ڈالنے کی ساعت اسی وقت تھی۔ ٹل جاتی تو پھر ایک مہینے پر بات جاتی۔ اب تم یہ الائچی لو اور کل آدھی رات کو کسی مرگھٹ میں دفنا دو۔ بس مطلب حاصل ہو جائے گا۔ سیم تن نے الائچی لی اور اسی دم واپس گئی۔ میاں آزاد چپ کے چپ کے سن رہے تھے۔ اب انھیں خوب ہی معلوم ہو گیا کہ شاہ جی رنگے سیار ہیں۔ آفتابے کا پانی تو انھوں نے پی لیا تھا اور شاہ صاحب نے معاً یہ پٹی دی کہ آنکھ بند کرتے ہی یہاں آئے اور پانی پی کر پھر کسی ترکیب سے چل دیئے۔ یہ سن کر آزاد خوب کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ شاہ جی کی باتوں سے ان کے دل پر نقش ہو گیا کہ بڑے ہی ذاتِ شریف ہیں۔ اتنا بڑا جھوٹا دیکھا نہ سنا۔ ایسے بڑے ولی اللہ ہو گئے کہ ان کی دعا سے ایک رانی پانچویں مہینے بچہ جن پڑی۔ اس کذب پر خدا کی سنوار۔ جھوٹ بھی تو کتنا اور عالم اشراق میں بھی حضور کو بڑا دخل ہے۔ چشم بد دور حق یوں ہے کہ جھوٹوں کے سردار ہیں مگر پیٹے بڑھالیے۔ تہ بند باندھ کر شاہ جی بن گئے۔ لگے پجنے۔ کوئی بیٹا مانگتا ہے۔ کوئی تعویذ کا خواستگار ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ میرا مقدمہ جتوا دو تو حق خدمت بجا لاؤں۔ کوئی کہتا ہے، فلاں عہدہ دلوا دیجیے تو مٹھائی کھلاؤں۔ اتفاقِ وقت سے مطلب بر آیا تو شاہ صاحب کی چاندی ہے۔ ورنہ مجال کس کی کہ شکایت کا لفظ

زبان تک لائے ڈرہے کہ کہیں زبان نہ سڑ جائے۔ اللہ ری دھاک۔ بہت سے دشمن عقل ان بنے ہوئے فقیروں کے دام تزویر میں پھنس جاتے ہیں بعض بعض تو معاذ اللہ انھیں دوسرا خدا سمجھتے ہیں۔ خدا ایسے خیالات مزخرف سے بچائے۔ میاں آزاد اس درویش معمر کی گفتگو سے سمجھ گئے تھے کہ پڑھے لکھے خاک بھی نہیں ہیں۔ ورنہ (بہ سبب) اور (نا محروم) نہ کہتے۔ بھلا ان پڑھ کندۂ ناتراش بھی مسلک خدا شناسی کے سالک ہو سکتے ہیں اور غیب کی بات تو جناب باری عز اسمہٗ کے سوا اور کوئی جانتا ہی نہیں۔ یہ شاہ جی بیچارے کیا کھا کر بتائیں گے۔ ع

'عالم غیب کیست غیر از حق'

یہ سب باتیں ہیں۔ ضعیف الاعتقاد آدمی ایسے جاہل مکاروں کے بھرّوں میں آئیں تو آئیں۔ ہم بھلا کب پھنسنے والے ہیں۔ اے تو بہ یہاں طفلی ہی سے فقیروں کے قائل نہ ہوئے اور ان شاہ جی نے تو کذب کے پل باندھ دیئے۔ وہ بے چاری عورت ناقص العقل دنیا کے حالات سے واقف نہیں جس کا جی چاہے بہکا دے ہم ایسوں کو شاہ جی چکما دیں تو ٹانگ کی راہ نکل جائیں۔

میاں آزاد کی کارستانی اور شاہ جی کی پریشانی

ہم سے کھل جاؤ بہ وقت مے پرستی ایکدن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایکدن

ہمارے بگڑے دل ہیکڑ سودائی مزاج رنگیلے جوان میاں آزاد ایسے

بنے ہوئے سدھ اور رنگے سیار فقیروں کی قبر تک سے واقف تھے فوراً تاڑ گئے کہ شاہ صاحب ایک ہی مرشد، بڑے ہی استاد، چھٹے ہوئے گرگے، پاک شہدے ہیں۔ خرقۂ سالوس در بر اور عمامۂ زور بر سر۔ گوکھوں کو پھانس پھونس کر ہنڈیا چڑھاتے ہیں۔ موہن بھوگ، حلوا پوری، قورمہ، باقر خانی اڑاتے ہیں۔ ان پڑھ گنوار چنگ پر چڑھ جاتے ہیں۔ سوچے کہ شاہ جی کی قرار واقعی مرمت کر دینی چاہیے۔ اتنے میں شاہ صاحب نے ایک صاحب نے ایک صاف شفاف چبوترے پر لنگی بچھائی اور اس پر دراز ہو کر مناجات پڑھنے لگے۔ مگر پڑھے لکھے تو تھے ہی نہیں صرف حافظے پر دار و مدار تھا۔ شین قاف تک درست نہیں۔ شاعری کا خوب دل کھول کر خون کیا اور اناپ شناپ بکنے لگے۔ ؎

خدایا جہاں بادشاہی تراست	ناخدبہ آمد آئی تراست
ہماں آفریدی بالا و بست	توئی آفریں نند آلا وکشت
توئی کاسماں راز میں ساکتی	زمیں راز مان و زمیں ساکتی
بنائی زما جو بس بخز کردنی	دگر خفتنی باز آبی خوردلی
دوکان ست بافرد فرخند گی	خداوندما از تو بندگی

شاہ جی بڑے سوز و گداز سے لہرا لہرا کر حضرت نظامی گنجوی علیہ الرحمۃ والغفران کے کلام معجز نظام کا خون اپنی گردن پر لے رہے تھے کہ میاں آزاد سے نہ رہا گیا۔ ایک دفعہ ہی بول اٹھے کہ دریا وحشت تیرا ہی آسرا ہے، اب تو شاہ جی چکر میں آئے۔ یہ آوازہ کس نے کسا۔ یہ حریف کون پیدا

ہوئے۔ یہ پھبتی کس نے کہی۔ اِدھر اُدھر دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، مگر آدم
نہ آدم زاد۔ انسان نہ انسان کا سایہ۔ یاالٰہی یہ کون بولا۔ یا خدا یہ کس نے
ٹوکا۔ سمجھے کہ یہ آسمانی ڈھیلا ہے۔ خدا کھوپڑی کو بچائے۔ ڈرپوک ضعیف
الاعتقاد تو تھے ہی، ڈرے کہ کوئی بلائے ناگہانی یا آفت آسمانی ہے۔ رونگٹے
کھڑے ہو گئے۔ بدن تھرتھرانے لگا۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ کشف و کمال
سب بھول گئے۔ حواس بلا اجازت سپاٹو پر ہو رہے۔ ہوش قلابازی کھانے
لگے۔ دفع بلا کی آیتیں پڑھنا شروع کیں۔ آخر میں بہ آواز بلند چلا اُٹھے
کہ (یا مظہر العجائب) ادھر بہ بول اُٹھے (لنگی مع شاہ جی غائب) اب شاہ جی
کی گھبراہٹ کا حال کچھ نہ پوچھیے۔ چہرے پر مُردنی چھا گئی۔ ع

'کاٹو تو لہو نہیں بدن میں'

دم بہ خود۔ میاں آزاد نے بھانپ لیا کہ شاہ صاحب پر رعب چھا گیا۔ جھٹ
نکل کر خوب پتوں کو خوب پاؤں سے کھڑکھڑایا۔ شاہ جی کانپ اُٹھے کہ پریتوں
کا لشکر کا لشکر آن کھڑا ہوا۔ اب گئے ہی گذرے۔ آزاد نے لحن داؤدی خاص
اہل عجم کے لہجہ میں ایک غزل پڑھی۔

گو شاہ جی الف کے نام بے کبھی نہیں جانتے تھے مگر رات خوب ہی
بھیگ گئی تھی اور چاندنی نکھری تھی۔ ہوائے سرد پھولوں کی بو باس کو منتشر
کر رہی تھی۔ آزاد نے ایسی سریلی آواز سے اس حقانی غزل کو گایا کہ کندۂ
ناتراش تک کو وجد آیا۔ شاہ جی مست ہو گئے۔ سمجھے کہ کوئی درویش باکمال
آنکلے۔ اب تو جان میں جان آئی۔ میاں آزاد کے قدم لیے۔ انھوں نے

پیٹھ ٹھوکی۔ شاہ جی اس وقت دو آتشہ اڑائے ہوئے تھے۔ نشہ کی ترنگ میں خیال بندھ گیا کہ کوئی آسمان سے اترا ہے۔

آزاد۔ کیستی واز کجائی و بامنت چہ کارست؟ سکوت تاکے! ما اسمک انت شیخ او سید۔

بلغنا المراد وزال العنا لک الحمد والشکر یا ربنا۔ اللہ بس باقی ہوس۔

شاہ جی کے رہے سہے حواس اور بھی غائب ہو گئے۔ زبان سمجھ میں نہ آئی۔ سمجھے کہ بے شک فرشتۂ آسمان ہے۔ ہماری روح قبض کرنے نازل ہوا ہے۔ دبے دانتوں گڑگڑاتے ہوئے فرماتے کیا ہیں، میں علم سے نامحروم ہوں گا۔ سمجھتا نہیں ہوں گا کہ آپ اس وقت کیا حکم دیتے ہیں۔ ہم نے بہت گناہ کئے۔ اب ماف (معاف) فرماؤ۔ کچھ دن اور جینے دو تو توبہ کروں کہ ٹھگ بدما چھوڑ دوں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ آپ فرشتے ہو، روح قبض کرنے آئے ہو۔

آزاد۔ پیرانہ سالی اور یہ بد اعمالی۔ یہ سن و سال اور یہ چال ڈھال۔ یاد رکھ کہ قعر جہنم میں پھینکا اور نار دوزخ میں جلایا جائے گا۔ سن میں فرشتۂ آسمانی نہ ملک نورانی۔ میں حکیم بلیناس کی روح پاک، عالم ہوں، حکیم ہوں، خدا ترس ہوں، رحیم ہوں، ملکوتی صفات ہوں، صاحب طلسمات و نیرنجات ہوں۔ شجاعت میں رستم سیستانی، حکمت میں ارسطوئے ثانی، مصوری میں وشک بہزاد و مانی۔ سکندر نامہ میں نظامی نے یہ شعر میری ہی شان میں کہا ہے

بلیناس فرزانہ را پیش خواند
بہ نزدیک جام جہاں بیں نشاند

میری تعریف و توصیف میں بڑے بڑے شعرائے بلند پایہ و سخن وران گراں نمایہ رطب اللسان ہیں۔ میرا مزار اسی جگہ پر تھا جہاں تیرا چبوترہ ہے اور جہاں تو ناپاک رہتا تھا اور شراب میں لنڈھاتا تھا۔ خیر تیری ناواقفیت کے سبب اسے مجھے میں نے چھوڑ دیا۔ لیکن اب آپ نے یہ نیا ہتھکنڈا سیکھا کہ اس زبان جادو جمال زہرہ تمثال کو بھالنا اور اس سے کچھ اینٹھنا چاہتے تھے۔ وہ اس زمانے میں میری منکوحہ اور مطبوعہ بیوی تھی۔ یہ اب یہ ہتھکنڈے چھوڑ کر دریا سے منہ موڑ۔ ورنہ تم ہو اور ہم۔ ابھی ابھی ٹھیک بناؤں گا اور ناچ نچاؤں گا۔ مفر اسی میں ہے کہ اپنا کل حال پوست کندہ راست براست بے کم وکاست کہہ چلو۔ تمہیں خود ہی بھگتو گے، میرا کچھ نہ جائے گا۔ شاہ جی نے شراب کی ترنگ میں مارے ڈر کے اپنی بپتی صاف صاف کہہ سنائی جس کو ہم اپنی زبان میں ادا کرتے ہیں ذرا کان دھر کر سنئے۔

شاہ جی۔ چودہ برس کے سن سے مجھے چوری کی لت پڑی۔ وہ مشاقی بہم پہنچائی کہ آنکھ چوکی اور گٹھڑی اڑائی۔ غافل ہوا اور ٹوپی کھسکائی۔ پہلے کچھ دن تو لوٹیا چور رہے۔ مگر یہ توکری بدیا ہے۔ چند ہی روز میں چوروں کے ولی کھنگڑ ہو گئے۔ سیند لگانا کوئی ہم سے سیکھے۔ کمند پر چڑھنا کوئی ہم سے سیکھے۔ چھت کی کڑیوں میں یوں چمٹ رہوں جیسے چھپکلی۔ اچک پھاند میں بندر میرے مقابلے میں گرد ہیں۔ دبے پانوں کوسوں نکل جاؤں، ممکن کیا کہ کسی کو آہٹ معلوم ہو۔ شہر بھر کے بدمعاش۔ اوباش۔ لقے لچے۔ شہدے۔ گرگے ہماری ٹکڑی میں شامل ہوئے۔ بڑے بڑے مہاجن ساہوکار

جھک کر سلام کرنے لگے جس نے ہیکڑی کی لی اس کو نیچا دکھایا۔ جو ٹیڑھا ہوا اس کو سیدھا بنایا۔ خوب چوریاں کرنے لگے۔ آج اس کا مال مارا، کل اس کی چھت کاٹی پرسوں کسی نواب کے گھر میں سیند دی۔ رفتہ رفتہ ڈاکے مارنے لگے۔ سڑکوں پر لوٹ مار شروع کر دی۔ تھانگ میں دنیا بھر کے بے فکرے جمع ہیں۔ ایک طرف یاران سر پل چانڈو اڑا رہے ہیں۔ دوسری طرف چرس کے دم لگا رہے ہیں۔ گانجا بھنگ بھرے سب کا شغل ہے تانیں اڑا رہے ہیں۔ شراب کی بوتلیں چنی ہوئی ہیں۔ گنڈیریوں کے انبار لگے ہیں۔ مکھیاں بھن بھن کرتی ہیں۔ سب کو یہی فکر ہے کہ کسی کا مال تاکیں۔ کرتی زردار کو رانہ بچ نکلے۔ داغی ضرور رہو۔ ایک دن شامت اعمال سے ایک نواب صاحب مقدرت کے ہاں چوری کرنے کا شوق چرایا ان کے خدمت گار کو ملایا۔ ماما چھوچھو کو کچھ چٹایا۔ ایک بجے کے وقت گھر سے نکلے۔ اسی محلے میں ایک مہینے قبل مکان کرایہ پر لیا۔ اسی مکان میں بیٹھے۔ نواب کا ایوان عالی شان کوئی پچاس ہی قدم کے فاصلے پر ہوگا۔ تین آدمی دس قدم پر اور پانچ بیس قدم پر کھڑے ہوئے ہم اور خدمت گار اور ایک چور ساتھ چلے کہ گھر میں دھنس پڑیں۔ قریب گئے تو ڈیوڑھی پر چوکی دار نے پکارا۔ کون۔ سن سے جان نکل گئی۔ عمر بھر میں یہی خطا ہوئی کہ چوکی دار کو پہلے سے نہ ملا لیا۔ اب کیا کریں۔ مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید بر کلہ خود باید زد۔ قہر درویش بر جان درویش۔ پھر چوکی دار نے للکارا کون آتا ہے۔ ہم نے کہا ہم ہیں بھئی (چوکی دار) ہم کی ایک ہی کہی۔ ہم کا کچھ نام بھی ہے۔ آخر کار ہم نے چوکی دار کو اسی دم کچھ چٹا کر

سیندھ دی گھر میں گھسے تو دیکھتے کیا ہیں کہ نواب صاحب پلنگ پر سوتے ہیں
اور ان کی بیگم دوسرے پلنگ پر خواب ناز میں ہیں مگر شمع روشن ہے ۔
اپنی ساتھی سے اشارہ کیا کہ شمع گل کر دے ۔ اتفاق وقت سے وہ ایسا گھبرایا
کہ بڑے زور سے پھونک ماری ۔ میں نے کہا خدا ہی خیر کرے ۔ ایسا نہ ہو کہ
نواب جاگ اٹھیں تو لینے کے دینے پڑیں ۔ آگے بڑھ کے میں نے بتی کو
تیل میں کھسکا دیا ۔ چلیے چراغ گل پگڑی غائب ۔ بیگم صاحب کے سرہانے
زیور کا صندوق رکھا تھا ۔ مگر آٹھ میں ۔ ہم تو ماما کی زبانی کچا چٹھا سن چکے تھے ۔
گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے ۔ فوراً صندوق اٹھایا اور دوسرے ساتھی کو دیا کہ باہر
پہنچائے وہ کچھ ایسا گھبرایا کہ مارے بوکھلاہٹ کے کانپنے لگا اور ایک دفعہ ہی
ارارا کر دھم ۔ دھماکے کی آواز سنتے ہی نواب چونک پڑے ۔ شیر بچہ سرہانے
سے اٹھا پلنگ سے اٹھ پینترے بدل بدل کر پھکیتی کے ہاتھ دکھانے لگے
میں نے ایک چاکی کا ہاتھ دیا اور چھٹ کمرے سے نکل دیوار پر چڑھ پھاند
کود اور چور چور پکارتا ہوا ناکے کے باہر ۔ وہ دونوں سر بوجھے تو سیکھے تھے دھر لیے
گئے ۔ مگر واہ رے نواب واللہ جری آدمی ہے ۔ دونوں کو گھیر لیا ۔ وہ تو جیل خانہ
گئے بندہ نلوہ بچا ۔ اب ہم نے یہ پیشہ چھوڑا اور سفاکی پر کمر باندھی ۔ ایک مہینے
میں تین خون کیے پہلے ایک سوداگر کو گھر میں گھس کر چارپائی پر ڈھیر کر دیا
اور جمع جتھا ہمارے باپ کی ہو گئی پھر ریل پر ایک مالدار جوہری کا گلا
گھونٹ ڈالا اور جواہرات صاف اڑا لیے ۔ تیسری دفعہ دو بنجارے سرا
میں اترے تھے ۔ ہمیں خبر ملی کہ ان کے پاس سونے کی اینٹیں ہیں ۔ ان کو

سراہی میں اتنا غفیل کرنا چاہا۔ بھٹیارن نے ہمیں دیکھ لیا غل مچایا پکڑے گئے۔ چالان ہوا مجسٹریٹ نے قید خانہ دکھایا۔ آٹھ دن رہے تھے کہ زریں دن آزادی یاد آئی۔ رات کو موقع پاکر کال کوٹھری کا دروازہ ایک کنجی بردار کا سر اینٹ سے پھوڑا۔ پہرے کے کانسٹبل کو اسی کی بندوق سے شہید کیا۔ صاف بھاگے۔ اب ہم سوچے کہ کوئی نیا پیشہ اختیار کریں۔ اس گانوں میں آئے تو عجب ہتھکنڈے سے درویش باکمال بن بیٹھے۔ فقیروں کا بھیس بدل کر ایک پیڑ کے نیچے بستر جما دیا۔ بیچے لگے کہ ایک دن اس گانوں کے ٹھاکر کا لڑکا بیمار ہوا۔ یہاں طبیب نہ ڈاکٹر۔ کسی نے کہہ دیا کہ ایک ولی اللہ پکریا کے نیچے بیٹھے یاد خدا کیا کرتے ہیں۔ چہرے سے نور برستا ہے۔ کسی سے لیتے ہیں نہ دیتے ہیں۔ ٹھاکر نے سنتے ہی اپنے بھائی کو بھیجا۔ ہم ساتھ گئے چہرہ بشاش کہ آج پالا ہمارے ہاتھ رہا تو عمر بھر چین سے گذرے گی۔ ہمارا پہنچنا تھا کہ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم کسی سے بولے نہ چالے (قدم درویشاں رد بلا) یہ آواز بلند کہہ کر لڑکے کے پاس بیٹھ گئے اور کچھ بڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ دیکھا کہ لڑکے کا برا حال ہے۔ بچنا محال ہے۔ ٹھاکر قدموں پر گر پڑا۔ ہم نے پیٹھ ٹھوکی اور لمبے لمبے ڈگ بڑھاتے چل دیے اسی دن حسن اتفاق سے ایک یوروپین ڈاکٹر دورہ کرتے ہوئے اس گانوں میں آئے اور ان کے معالجے سے مریض چنگا ہو گیا۔ اب لطف دیکھیے کہ ڈاکٹر کا تو کوئی نام بھی نہیں لیتا۔ سب ہماری تعریف کرتے ہیں۔ کوئی عیسیٰ بناتا ہے۔ کوئی خدا سبدہ کہتا ہے۔ ٹھاکر نے ہمیں ایک ہاتھی اور ہزار روپیہ دیا۔ وہ ہم نے قبول نہ کیا۔ سبحان اللہ پھر تو ہوا بندھ گئی۔ اب چوطرفہ ہم ہی ہم ہیں۔

کوئی بیمار ہو تو ہم پوچھے جائیں۔ کوئی مرے تو ہم بلائے جائیں میاں بیوی کی شکر رنجی میں ہم قاضی بنتے ہیں۔ باپ بیٹے کا جھگڑا ہم فیصل کرتے۔ صبح سے شام تک ڈالیوں پر ڈالیاں اور نعمتوں پر نعمتیں ہمارے سامنے چنی رہتی ہیں۔ عورت، مرد، غریب وامیر برنا و پیر سب زیارت کو آتے ہیں۔

ہمارے آزاد منش بے باک روش، پاکیزہ مشرب، عالی گوہر فرخندہ اختر، معزز و ممدوح میاں آزاد اب حکیم بلبیناس فرزانہ کی روح بن بیٹھے۔ بھئی واللہ کیا کیا فقرے یاد ہیں۔ اچھا روپ بدلا۔ واہ استاد کیا کہنا ہے، بابا ں قدم لے شاہ جی کو دو نا گیدڑ بھبکی بتائی کہ آئے حواس غائب ہو گئے۔ شراب کے نشے نے سمند وحشت پر ایک اور کوڑا جمایا۔ شراب مکر و زور کا سارا حال مو بہ مو کہہ سنایا۔ واللہ اچھا سہل نسخہ ہاتھ آیا۔ شاہ صاحب کی قلعی کھل گئی۔ سچ ہے ہر فرعونے را موسیٰ۔ گانوں بھر چرکھایا تھا۔ خوب دام تزویر پھیلایا تھا۔ اب پھنسے بچہ جی۔ ہات تری دم میں نمدا۔ میاں آزاد نے جب دیکھا کہ مارے بوکھلاہٹ کے ان کی جان پر بن آئی ہے تو تشفی دی اور یوں سمجھایا۔

آزاد۔ سنو شاہ جی! ہم تمہیں چیر چٹھو کئے بغیر نہ چھوڑیں گے، نہ چھوڑیں گے۔ ہم سے بھاگ کر تم جاؤ گے کہاں۔ ساری خدائی سے تو ہم ڈھونڈ نکالیں۔ سمک سے سما اور ثریٰ سے ثریا تک اپنا راج ہے، لیکن ہماری بیعت لاؤ، ہمیں اپنا پیر بناؤ تو چھوڑ دیں۔ اس وقت تو مزے سے پانوں پھیلاکر سو رہو۔ کل تڑکے گجر دم گانوں بھر میں غلغلہ ڈال دو کہ ہمارے پیر مقدس نے قدم رنجہ فرمایا ہے۔ مگر ہمارا سن دو سو گیارہ برس کا بتانا اور سب سے

کہہ آنا کہ ابھی نام خدا سبزہ آغاز اور جوان طناز ہی معلوم ہوتے ہیں۔

شاہ جی کی باچھیں کھل گئیں کہ چلو کسی طرح جان تو بچی۔ نور کے تڑکے تمام گانوں میں اس سرے اس سرے تک پکار آئے کہ ہمارے مقدس پیر آئے ہیں۔ جسے دیکھنا ہو دیکھ لے۔ شاہ جی کی تو وہاں دھاک بندھی ہی تھی۔ جب لوگوں نے سنا کہ ان کے بھی ولی کھنگڑ آئے ہیں تو شوق چرایا کہ زیارت کو چلیں۔ دو دن اور دو رات میاں آزاد نے کسی کو رُخ تاباں نہ دکھایا۔ تیسرے دن فقیرانہ لباس پہن کر ہرے ہرے پیڑوں کے ٹھنڈے ٹھنڈے سایہ میں آن بیٹھے۔ میاں آزاد گل خام و نازک اندام حسین و مہ جبین تو تھے ہی شنجرفی بند اور شنجرفی پیرہن نے آتش حسن کو اور بھی بھڑکا دیا۔ دیکھتے کیا ہیں کہ پو پھٹتے ہی زن و مرد غریب و امیر برنا و پیر زیارت کو آرہے ہیں۔ ٹھٹ کے ٹھٹ جمع۔ ہندو اور مسلمان کی عورات جوان کو دیکھ کر ان کی آنکھوں سے خون ٹپکنے لگا۔ جوان کم سن جادو جمال زہرہ تمثال شوخ و طناز، خوش انداز۔ سراپا ناز زیور سے مزین۔ لباس گراں بہا سے مشین چھما چھم کرتی چلی آتی ہیں۔ دس دس کوس سے فنسوں پر سوار بصد شوق زیارت آئی ہیں۔ نمکین طرحدار چھریاں ساتھ بانکی ادا سے فنس کے کونے پر ہاتھ، کوئی بڑے ٹھسے سے ڈولی پر کوئی پیادہ پا غنچہ کھلا ہوا ہے۔ میاں آزاد نے دل ہی دل میں ان کے ورثا کو خوب صلواتیں سنائیں کہ فقیر اور باکمال کا نام سنتے ہی کیا جھٹ سے بھیج دیا۔ خدا کی مار۔ شیطان کی پھٹکار۔ ان کو اتنی عقل بھی نہیں ہے کہ ذرا دل میں سوچیں کہ ہم بھیجتے کہاں ہیں؟ الٰہی توبہ! الٰہی توبہ۔ میاں آزاد نے نہایت جوش و خروش اور فصاحت و بلاغت

کے ساتھ اشعار اور آیات پڑھنا شروع کیں اور خوب ہی بنے بھئی واللہ کیا بھیڑیا دھسان خلقت ہے۔ جس نے گیڑے رنگ لیے وہی خدا رسید؟ بن بیٹھا۔ دنیا بھر کے بے فکرے فقیر کے لباس میں مال مارتے ہیں اور اکثر تربیت یافتہ ثقات مسن تک ان کے باکمال ہونے پر گنگا اور قرآن اٹھاتے ہیں۔ کوئی ذی عقل سمجھائے تو الٹی آئیں گلے پڑیں۔ ؎

خیانت سے مکا ئد سے دغا سے
خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے

اردو لٹریچر کے عناصر خمسہ

آیندہ زمانہ میں اردو لٹریچر کی اگر تاریخ لکھی گئی تو انیسویں صدی کا پچھلا دور اس عہد کا "نشاۃ الثانیہ" (یعنی دور جدید) ہو گا، جس میں ایک بازاری زبان جس کا سرمایۂ ناز ایک بے غایت شاعری کا مجموعہ، خودرو تھا منازل ارتقائی طے کرتی ہوئی اس سطح امتیازیہ کے قریب قریب پہونچ گئی جہاں دنیا کی اعلیٰ تر زبانیں اپنا سکہ جما رہی ہیں۔

کل کی بات ہے جب تُک سے تُک ملا لینا کمال فن سمجھا جاتا تھا۔ گرمی محفل کے لئے چند مصرعوں کی پیوندکاریاں لٹریچر کے فرائض سے ہم کو سبک دوش کر دیتی تھیں، لیکن اقتضائے وقت کے ساتھ تغیر مذاق دیکھئے کہ آج ہم کو ان کے ذکر سے بھی شرم آتی ہے۔

یہ کیوں؟ صرف اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں، کائنات میں کوئی چیز نہیں جو تغیر پذیر نہ ہو۔ ہمارے جذبات بدلے، خیالات بدلے، تغیر حالت کے ساتھ وہ آثار خارجی بھی جن میں ہم گھرے ہوئے تھے، کچھ سے کچھ ہو گئے۔ غرض زمین بدلی، آسمان بدلا اور ہم بھی وہ نہیں رہے جو پہلے تھے اور ابھی معلوم نہیں مؤثرات خارجی اور واقعات کی قدرتی رَو ہم کو کہاں سے کہاں لے جائے گی۔

اس کش مکش اور سلسلۂ انقلابات میں اتنا ہوش کہاں کہ طبقات ارتقائی کی

درمیانی کڑیاں آپ کو گنائی جائیں، صرف یہ سمجھ لیجئے کہ بوسیدہ اور فانی اجزا کی جگہ قوی تر عناصر نے لی اور اقلیم سخن کی شریف تر ہستیاں عالم وجود میں آئیں جن سے اردو سا کم سواد لٹریچر ایک دم سے آشنائے فلسفہ، ادب ہو گیا۔

میری غرض لائق عزت سر سید، پروفیسر آزاد، نذیر احمد، حالی، شبلی سے ہے، جن کے قلم کے سایہ میں اردو یعنی کل کی چھوکری اتنی رو دار ہو گئی کہ السنۂ یوروپ یعنی مغربی بہنوں سے بے تکلف آنکھیں ملا سکتی ہے۔ ان میں ہر شخص مختص النوع خصائص ادبی کے ساتھ اپنے اپنے دائرہ کا آپ مالک ہے اور جس طرح ادب القدما (یعنی کلاسیکس) آج واجب التعظیم سمجھا جاتا ہے، ایک وقت آئے گا۔ جب ان کے ادبیات کا بیشتر حصہ لائق پرستش اور غیر فانی سمجھا جائے گا۔

یہ موضوع نہایت اہم ہے اور چوں کہ بہت پھیلایا جا سکتا ہے، اس لئے سرسری طور پر ٹالنا منظور نہیں، بلکہ میری خواہش ہے کہ آج کل کے اچھے لکھنے والے اس پر قلم آزمائی کریں۔ میری غرض لائف نگاری سے نہیں ہے بلکہ صرف تنقید ادبی (یعنی لٹریری ریویو) چاہتا ہوں جس میں بہ لحاظ فن فرداً فرداً ہر مصنف کے نتائج فکر کی خصوصیات اس طرح دکھائی جائیں۔ کہ ایک حد تک تنقیدات عالیہ (یعنی ہائر کریٹی سزم) کا حق ادا ہو جائے۔

سر سید نے ادب اور معقولات پر جس حد تک مجتہدانہ رنگ چڑھایا در اصل ان کی اولیات میں داخل ہونے کے لائق ہے۔ یہ انھیں کے قلم کی ہم آوازِ بازگشت ہے جو ملک میں بڑے سے بڑے مصنف کے لئے

دلیل راہ بنی۔ آج جو خیالات بڑی آب و تاب اور عالمانہ سنجیدگی کے ساتھ
مختلف لباس میں جلوہ گر کئے جاتے ہیں، دراصل اسی زبردست
اور مستقل لباس میں جلوہ گر کئے جاتے ہیں، دراصل اسی زبردست
اور مستقل شخصیت کے عوارض ہیں ورنہ پہلے یہ جنس گراں باوصف
استطاعت اچھے اچھوں کے دست رس سے باہر تھی۔ سر سید کے کمالات
ادبی کا عدم اعتراف صرف ناشکری نہیں بلکہ تاریخی غلطی ہے اور میں خوش
ہوں کہ شریف النفس حالی نے آج کل کی بہتر سے بہتر "سوانح عمری"
لکھ کر منحرف طبائع کو بہ وساطت سخت سے سخت شکست دی جو خیال
میں آسکتی ہے، لیکن نئی نسل پچھلا سبق کسی قدر بھول چلی ہے، حالاں کہ
سر سید کے حقوق زیادہ تر اسی کی گردن پر ہیں، بلکہ مجھے کہنا چاہئے
کہ لٹریچر کے حقوق کا اقتضا یہ ہے کہ سر سید کے علمی کارنامے پر نگاہ عکس ریز
ڈالی جائے، اور اس کے لئے سید سجاد حیدر (یلدرم) مجھے زیادہ موزوں
معلوم ہوتے ہیں۔

علامہ نذیر احمد کو میں "شم المارہروی" تو یہ! سید افتخار عالم کے سر لگانا
چاہتا ہوں جنہوں نے حال میں مولانا کی نہایت مفصل سوانح عمری
شائع کی ہے۔ باستحقاق ان سے بہتر کوئی شخص خیال میں نہیں آتا، یہ
لکھیں گے اور ہمدردانہ اور سخن گسترانہ لکھیں گے، اسی کی ضرورت ہے۔
نذیر احمد گو ایک حد تک "غلطیات" سے رسیاں تڑاتے رہے لیکن ادب
اور "منقولات" سے متعلق جو دفتر انھوں نے چھوڑا ہے، وہ اس قدر

اہم ہے کہ کچھ سرسری ریمارک کرنا چاہتا ہوں مگر سمجھ میں نہیں آتا کہاں سے شروع کروں۔ ان کی اعلیٰ درجہ کی عربیت کے ساتھ بے مثل قدرت بیان، وسیع ذخیرۂ الفاظ اور وہ تصرفات جو جدت خیال اور ظریفانہ نکتہ سنجیوں کے لحاظ سے صرف اس شخص کا حصہ ہیں، لٹریچر کی جان ہیں، اس پر اضافہ کیجئے اردو سی کم مایہ زبان کا ایسے شریفانہ قالب میں ڈھلنا جس پر کلاسیکس کا دھوکا ہو۔

بعض صاحبوں کو غالب کی طرح ان کی مشکل پسندی کا رونا ہے، اور وہ پیچیدہ کاریاں جو ان کی شستہ رفتہ اور برجستہ اردو میں ہوتی ہیں جس میں انگریزی زیادہ بے جوڑ ہوتی ہے عام خیال ہے کہ ثقل سے خالی نہیں لیکن انصاف یہ ہے کہ یہ سب ان کی جدت اختراع اور قوت آخذہ کا زور ہے۔ آمد کی رو میں اضطراری طور پر اپنے پرائے کی تفریق نہیں ہو سکتی اور یہی وجہ ہے کہ بعض حصے بہ لحاظ ترکیب و تحلیل اجزائے السنۂ غیر گنگا جمنی ہوتے ہیں، تاہم متانت اور حسن کلام سے کبھی علیحدہ نہیں ہوتے جو ان کے لٹریچر کا خاصہ طبعی ہے، نہ ان کے اچھوتے اور مستقل طرز ادا اسٹائل پر جو شارع عام سے الگ تھلگ اور آپ اپنی نظیر ہے، کوئی اثر پڑتا ہے۔ جو باتیں اوروں کے ہاں بے گانی ہیں ان کی بے ساختگی اور برجستگی خیال کے ساتھ سلسلۂ بیان میں اس طرح جذب ہو جاتی ہیں کہ مغایرت یا اجنبیت کا احساس تک نہیں ہوتا، پھر بھی جہاں تک اس حیثیت سے اعتراض کی گنجائش ہے، ادب چاہتا ہے، سبک نکتہ چینیوں سے

ان کا کمال ہمیشہ بے نیاز رہے گا۔

میں آج تک یہ فیصلہ نہ کرسکا کہ باوصف کمالات علمی جو ایک حد تک ان کے ہم عصروں کو بھی مرعوب کرنے والے تھے، ان کی فطری قابلیت اور اعلیٰ مذاق سخن کی آزمائش کا بہتر سے بہتر پیرایہ کیا ہو سکتا تھا۔

جس طرح ناولوں اور تراجم میں بہ رعایت فن یہ اپنی قادرالکلامی کا بڑے سے بڑا ثبوت دے سکے، لٹریچر کے وہ اجزا جن کا موضوع زیادہ اہم اور سنجیدہ ہے، مثلاً فلسفہ، تاریخ وغیرہ، جس میں وسعت نظر کے ساتھ تحقیق و تنقید قوت استقرا، تفریع مسائل اور فلسفہ، استخراج نتائج کے ساتھ غیر منقطع انضباط خیال کی ضرورت ہے، یہ قصداً اس طرف نہیں آتے۔ یہی حد فاصل ہے۔ جو شبلی کے قلم رو سے ان کے دائرہ کمالات کو جدا کرتی ہے اور یہی وہ آزادی ہے، جس کے آثار ان کے لکچروں میں آپ دیکھیں گے اور جس کی بنا پر اکثر کہا گیا ہے کہ وہ موضوع سخن کے حدود کو قائم نہیں رکھ سکتے، لیکن سچ یہ ہے کہ ان کا مرتبۂ انشا پردازی چاہتا ہے کہ ہم مان لیں کہ یہ صرف زور بیان کا قصور ہے، جو اظہار فصاحت میں کسی چیز کا محکوم نہیں ہوتا۔

زمانہ کتنی ہی ترقی کرے، اس علم کے پتلے کو پھر پیدا نہیں کر سکتا جس کا کوئی رونگٹا بے کار نہیں۔ جہاں تک لائق ادیب وہ مشرقیت کا تعلق ہے، قوم کی یہ آخری بہار تھی جس کے اجزا اکچھ اٹھ گئے، کچھ باقی ہیں۔ قدیم علوم کے نام لیوا ایک آدھ سے زیادہ نہیں ہیں، جس عربی مرحوم عربی کو

ہم بیسویں صدی میں ڈھونڈھتے ہیں، علامہ نذیر احمد کے ساتھ دفن ہوگئی، مگر ان کا حصۂ غیر فانی یعنی ان کی تصنیفات مرنے والی چیز نہیں، وہ اپنی بقائے دائمی کی آپ ضامن ہیں، اور یہی انسان کا بڑے سے بڑا تخییل (آئیڈیل) ہے جس سے دنیا میں کوئی بے نیاز نہیں۔

نذیر احمد کے استادانہ اور باوقار لٹریچر کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا یہ ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی اب ہو نہیں سکتی، لیکن اخلاف کے لئے جس قدر سرمایۂ علمی انھوں نے چھوڑا ہے وہ موجودہ اور آیندہ نسلوں کو ہمیشہ ان کی یاد دلاتا رہے گا۔ ہم ان کی قیمتی تصنیفات کو سینہ سے لگائیں گے، آنکھوں پر جگہ دیں گے، دائمی جدائی کے بعد، ادائے سپاس کا حق کچھ تو ادا ہو رہے۔

سرسید کے بعد اگر ان کے رنگ میں کوئی قلم ہاتھ میں لے سکتا ہے تو بزرگ حالی ہیں۔ یہ ایک ہی وقت میں جہاں فطری شاعر ہیں، اعلیٰ درجہ کے ناثر بھی ہیں، لائف نگاری کے ساتھ نکتہ سنجی اور سخن آفرینی کا ایک خاص سلیقہ ہے۔ جس نزاکت کے ساتھ ادائے خیال کے مختلف پہلوؤں سے دیکھتے دیکھتے یہ اپنا مطلب نکال لیتے ہیں، کثرت مواد کے ساتھ بھی دوسرے اس قسم کے لطیف تصرفات نہیں کر سکتے۔ طبیعت میں ایک چچا تلا خاص طرح کا مادہ ہے جو حشو وزوائد سے غرض نہیں رکھتا اور ساتھ ہی کسی موضوع بحث میں ان نکات متعلقہ کی طرف نہایت خوب صورتی سے فوری انتقال ذہن کا باعث ہوتا ہے جو درا صل اس بحث کی جان ہوتے ہیں۔ لٹریچر کا بہت بڑا وصف یہ ہے کہ سخت سے سخت مسائل باتوں باتوں میں طے کر دیئے جائیں۔ یہ سلاست و لفاست

قدرت کلام کی آخری حد ہے، جو سرسید کے بعد حالی کے حصہ میں آئی۔

ایک خاص بات یہ ہے کہ ان کے خیالات و مقالات میں جھول جھال یعنی کسی طرح "تذبذب فی الرائے" نہیں ہے خالص یک رنگی ہے، جسے اصطلاح میں فلسفیانہ کہئے۔ معیار خیال اس قدر بلند پایہ اور سلجھا ہوا ہے کہ کہیں سے بیگانہ نہیں ہوتے۔ مجھے ہنسی آتی ہے جب سنتا ہوں کہ حالی کی جدید شاعری بہ لحاظ فن ساقط المعیار ہے اور اس لائق نہیں کہ اس پر توجہ کی جائے۔ یہ فتویٰ "پرانی لکیر" کے شیدائیوں کا ہے جو خیر سے یہ بھی نہیں جانتے کہ شاعری دراصل کیا چیز ہے اور اس کا موضوع اصلی کیا ہے؟ بھیڑوں کا ایک غول ہے، جو مدت ہوئی آنکھیں بند کئے ایک راستہ پر پڑ لیا اور آگے پیچھے آج تک چلا آیا، لیکن ہم کو اس سے کچھ بحث نہیں۔ نہ ہم اس مجموعۂ روایات پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں، جو پرانے خیال والوں کا سرمایۂ ناز ہے۔ ہم ایک حد تک معصوم حماقتوں سے کسی کی ہوں، لطف اٹھانے کے لئے تیار ہیں کیوں کہ یہ بھی ایک عیش ہے، صرف اتنا کہیے کہ برے بھلے حالی کو جدید گروہ کی لائق فخر پیشوائی کے لئے چھوڑ دیجئے۔

میرا خیال ہے حالی کے کلام پر مولوی عبد الحق کھل کر داد سخن دیں گے۔ یہ آج تک باوصف قابلیت اور فلسفیانہ مذاق کے صرف "مقدمات" پر ٹالتے رہے، ان کا مصرف صحیح کچھ اور تھا۔ ان میں مادۂ اختراعی (اپج) خاصا ہے، مگر قوت فیصلہ کی کمی "صحافت" سے آگے بڑھنے نہیں دیتی حالانکہ ان کا سلیقۂ تحریر سفارشی ہے کہ مستقل تصنیف و تالیف کے سوا یہ کچھ اور نہ کرتے۔ بہرحال ان کو کم سے کم میری خواہش تو پوری کرنی ہوگی۔

یادش بخیر! شبلی پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جس سے زیادہ ایک زندہ مصنف پر قلم آزمائی کی گنجائش نہیں۔ چبائے ہوئے نوالوں کا بار بار منہ میں پھیرنا، خواہ وہ کتنے ہی خوش ذائقہ ہوں، جدت طرازی جائز نہیں رکھتی اور جیوں کہ کوئی نئی بات نہیں کہہ سکوں گا اس لئے مختصراً اس قدر کافی ہے کہ شبلی ملک میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے تاریخ پر فلسفہ کا رنگ چڑھایا اور حکیمانہ انکشاف و نکتہ آرائیوں سے اسے ایک مستقل فن بنا دیا۔

علی گڈھ کو انھوں نے چھوڑا اور ندوۃ العلماء نے، مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے خود ان کو۔ لیکن میرا بس ہو تو شبلی کو ہندوستان سے باہر کالے کوسوں یورپ کے کسی "بیت الحکما" (لٹریری اکیڈمی) میں بھیج دوں جہاں ان کو اپنی غیر معمولی قابلیت کی داد بڑے بڑے علمائے مستشرقین سے ملے گی جو بہ لحاظ ہم فنی ان کے یاران طریقت ہیں۔ شبلی کا وسیع دائرہ تحقیقات، اہل زبان کی سی فارسی، اس میں بھی شاعری کا ملکۂ راسخہ اور سب سے زیادہ اپنی زبان میں ان کی لائق رشک انشاپردازی وہ صفات ہیں جو علامہ کو ان کے ہم نفسوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ شعر العجم کے چوتھے حصہ میں فلسفۂ شاعری پر مختلف پہلوؤں سے جس جس طرح تنقید کا حق ادا کیا گیا ہے "ادب الاساتذہ" کا بہتر سے بہتر مرقع ہے جس پر دنیا کی کوئی زبان فخر کر سکتی ہے۔

اردو میں ان کے مطائبات نظم کو جو جدید پیدا وار ہیں ان کے سلسلۂ کمالات سے علیحدہ کر کے دیکھئے، جن میں لطائف ادبی کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں۔ یہ رنگ بھی ان ہی کا حصہ ہے۔ شوخی کے ساتھ

سنجیدگی یہ معلوم ہوتا ہے دُور سے زبان کی بلائیں لے رہی ہے۔

لیکن اس جامعیت کے ساتھ بھی سوال یہ ہے کہ قوم نے کہاں تک حوصلہ افزائی کی؟

کل کی بات ہے ایک اتفاقی واقعہ پر شبلی پر ملک کے چپہ چپہ سے لے دے شروع ہو گئی اور اس قدر غل شور ہوا کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی بڑے بڑے سنجیدہ حضرات اپنے نامۂ اعمال کی طرح اخباروں کے کالم سیاہ کرتے رہے جس سے کچھ دنوں کے لئے اخباری افق کی فضائے بسیط ایک دم سے تیرہ و تار ہو گئی۔ کیا یہ کوئی علمی واقعہ تھا؟ ہر گز نہیں! صرف حاسدین کی کم نظری تھی۔ دلوں کی جمی ہوئی سیاہی لغزشِ قلم سے ٹپکی اور بری طرح ٹپکی۔

لیکن شرافت علم دیکھئے! شرر کو جو "شبلی" پر کبھی کبھی سخن گسترانہ چوٹیں کرتے تھے اس ناگوار واقعہ کے بعد جس کا انجام ندوہ سے مولانا کی دست کشی پر ہوا، اپنی آواز بلند کرنی پڑی۔ وہ صاف صاف کہہ گذرے کہ ندوہ میں جو کچھ دم تھا شبلی کی وجہ سے تھا۔ اب وہ ایک جسد بے روح ہے۔ اسی ضمن میں مولانا کے کمالات کا شناسانہ اعتراف اور قوم کی ناسپاسی کا رونا تھا۔

"نقاد" میں "تاریخ کا معلم اول" کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا تھا، ایک قاصر النظر نے اہتمام کے ساتھ "مشرق" میں اس کی تردید کی جسارت کی لیکن عامیانہ و حاسدانہ، جس میں علامہ شبلی کو ان اوصاف

سے معرا کر کے دکھایا تھا جو مضمون نگار نے حسن عقیدت سے نہیں بلکہ خود "فلسفہ" کے ایما سے غیر فانی شبلی کی طرف منسوب کئے تھے۔

بہر حال میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ شبلی پر اگر کوئی قلم اٹھانا چاہے تو جی لگنے کے سامانوں میں کمی نہیں۔ میرے خیال میں سید عبد الماجد اگر فلسفۂ تاریخ سے اتنی ہی دل چسپی کا اظہار کرتے جس اہتمام سے "الکلام" پر منحرفانہ نظر ڈالی گئی تھی تو کفارۂ معصیت کے ساتھ تنقید کا بھی حق ادا ہو جاتا۔

سب سے آخر مگر دراصل سر فہرست آزاد پر میں خود کچھ لکھنا چاہتا ہوں آزاد اس پایہ کے ادیب ہیں کہ ان کے دائرہ کے اور خلاقین سخن کو ان کے آگے سر جھکانا پڑے گا۔ آزاد کی جن حیثیتوں پر خصوصیت کے ساتھ نگاہ پڑ سکتی ہے وہ تحقیقات السنہ کے مذاق کے ساتھ پاکیزگی زبان اور آزاد کا خاص انداز بیان ہے جس سے ان کی نثر عموماً زرنگار معلوم ہوتی ہے۔

ایک مغربی شاعر کے خیال میں جس نے شوخی سے عالم فطرت (نیچر) پر کمال صنعت (آرٹ) کو ترجیح دی ہے خوش آب موتیوں کا نشاط انگیز انتشار کے ساتھ فرش ریشمی پر بکھر جانا، روانی آب سے زیادہ دل کش ہے۔ مگر اس سے زیادہ تر دل کش ہے کسی نازک خیال مصنف کی مرصع پیدا اور دماغی جو حسن صوری اور معنوی کے ساتھ آمد اور بے ساختہ پن کی تصویر ہو۔ اس کے سلیس و نفیس لٹریچر کا یہ وصف اضافی کہ روکھے پھیکے مسائل کو بھی اس لطافت سے جذب کر سکے کہیں سے بار طبیعت نہ ہو اور فسانے (یعنی لائٹ ریڈنگ) کا لطف آئے میرا خیال ہے لائق ذکر خصائص میں سے

ہے جس کی بنا پر ایک مشہور موقع پر یہ کہا گیا تھا کہ "آزاد" اردوئے معلی کا ہیرو ہے۔"

جس طرح تاریخ میں فلسفہ کا رنگ سب سے پہلے شبلی نے چکایا، اردو کو انشا پردازی کے درجہ پر جس نے پہنچایا وہ آزاد اور صرف آزاد ہیں اور گو اس مسئلہ پر بھی کافی توجہ نہیں کی گئی ہے لیکن آزاد کی ادبی فتوحات تاریخ لٹریچر کا ایک واقعہ ہے جس کا فیصلہ خود فلسفہ، ادب کے ہاتھوں ہوگا۔ جن حضرات کی نگاہیں دلی، لکھنؤ کے اختلافات تک محدود ہیں یا جن کی قاصر النظری میرے اس خیال کی تائید کی مانع ہو وہ مجھے معاف فرمائیں گے اگر میں بلا خوف تردید یہ عرض کروں کہ پروفیسر آزاد کا درجہ بحیثیت ادیب جو کچھ ہے اس کا سمجھنا دوم درجہ کی خلقت کے لئے جو فلسفہ لٹریچر سے بیگانہ ہے آسان نہیں ہے، اس لئے کسی اختلافی بحث کا چھیڑنا "گول خانہ میں چوکھنٹی چیز" سے بھی زیادہ گیا گذرا ہوگا۔ سر سید سے "معقولات" الگ کر لیجئے تو کچھ نہیں رہتے، نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے، شبلی سے تاریخ لے لیجئے تو قریب کورے رہ جائیں گے حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں لیکن "آقائے اردو" یعنی پروفیسر آزاد صرف انشا پرداز ہیں جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں، اسی لئے واقعات بھی انھوں نے جس قدر لکھے ہیں "قصص" (یعنی ٹیلز) کی حیثیت رکھتے ہیں، جنھیں "افسانۂ یاران کہن" سمجھئے۔

اس بحث کو اصل تنقیدی مضمون میں پھیلاؤں گا یہاں افتتاحی حیثیت سے بھی قوت کا صرف کرنا منظور نہیں۔ اسی سلسلہ میں آپ دیکھیں گے کہ جدید

شاعری جس کے "آدم" حالی سمجھے جاتے ہیں؟ غالباً اس کی داغ بیل سب سے پہلے آزاد نے ڈالی تھی۔ مجھ کو آزاد کے لٹریچر سے غیر معمولی دلچسپی ہے اس لئے ذرا تفصیل کے ساتھ ان کی دل کش تصنیفات کے ان اجزا کو ابھار کر دکھاؤں گا جن کا ایک ایک حرف لٹریچر کی جان ہے۔

بہرحال ارکان خمسہ کی تجویز آپ کے سامنے ہے۔ اکبری نورتن کے مقابلہ میں بعض صاحبوں کو یہ تحدید پسند نہ آئے گی لیکن مجھے افسوس ہے کہ "مصنفین کی صف اول" میں اس سے زیادہ گنجائش معلوم نہیں ہوتی۔ تاہم غیر ضروری نکتہ چینی سے علیحدہ ہو کر اگر کوئی صاحب (بہ شرط کہ لٹریچر کا صحیح مذاق رکھتے ہوں) مجھے مفید مشورہ دے سکیں، تو میرا خیال ہے میں اس پر غور کرنے کے لئے ایک حد تک تیار ہوں۔

چرخِ شعبدہ باز

اساتذہ کے لٹریچر میں آسمان کا ذکر اُس کے عدم وجود کے ثبوت میں اس قدر نہیں جس قدر کہ اس کی شعبدہ بازیوں کا حال ہے۔ آسمان کے عدم وجود سے مجھے بھی بحث نہیں لیکن اس کی شعبدہ بازیاں واقعی اس قدر مشہور ہیں کہ تمام دنیا کے مداری۔ بھان متی۔ بازی گر اس کے آگے کان پکڑتے ہیں۔ چرخ شعبدہ باز کا یہ ایک ادنیٰ کھیل ہے کہ اس کے نیلے پٹارے ہیں سے جیسے آسمان کہئے آغاز عالم سے خدا جانے کتنے چٹے بٹے نکال چکا ہے اور نکالے چلا جائے گا۔ بڑے بڑے شعبدہ باز و نظر باز اس کے الٹ پھیر کو نہ سمجھ سکے۔ شعبدہ بازی کے کمال میں ہے کہ بچے کو بڈھا اور بوڑھے کو جوان بنا دیا تو گویا بہت بڑی بات کی۔ سو وہ بھی ایک آدھ کو اور دو چار بار۔ چرخ شعبدہ باز کو ایک زمانہ گزر گیا کہ ہر بچے کو بوڑھا کر کے دکھا رہا ہے مداری ایک شاخ سے درخت بنا کر دکھا دیتا ہے اور دور سے پھل بھی مگر یہ پھل دور سے دیکھنے کے سوا اور کسی کام کے نہیں اور دیکھنا بھی چند ساعت کا یہاں ایک رائی کے برابر دانے سے سر بفلک درختوں کے جنگل کے جنگل دیکھ لیجئے بہار کو خزاں اور خزاں کو بہار کر دکھانا اس کا معمولی کھیل ہے۔ تمام عالم کے درخت جو ابھی برگ و بار سے عریاں تھے یا دیوانوں کی طرح کپڑے پھاڑ چکے تھے کہ

بہار نے اک بارگی سب کو سبز و سُرخ جوڑے پہنا دیئے۔ معمولی بازی گر مشکل سے آگ اور پانی اکٹھا کر کے دکھاتے ہیں۔ عالم اسباب نے نہ صرف آگ و پانی کو بلکہ ہوا و خاک اربعہ عناصر کو جمع کر کے بے گنتی پتلے بنا بنا کر دکھا دیئے اور انہیں کو بگاڑ کر بناتا چلا جاتا ہے۔ ایک کو مارتا ہے تو دو کو جلاتا ہے۔ وس دانے زمین میں دباتا ہے تو سَو اُگاتا ہے۔ بے جان سے جاندار پیدا کرتا ہے اور جاندار کو بے جان کر دیتا ہے۔

ایک شاخ سے دو پھول نکالتا ہے۔ ایک کو حسینوں کے گلے کا ہار بناتا ہے، دوسرا قبر پر چڑھایا جاتا ہے۔ آسمان کی وہی بارش جو انگور پیدا کرتی ہے اسی سے اونٹ کٹارے پیدا ہوتے ہیں۔ چرخ کی ایک گردش دولابی نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بلا قصور کنوئیں میں گرایا جس پر حضرت جامی نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

فغاں زیں چرخ دولابی کہ ہر روز

بچاہے افگند ماہے دل افروز

اسی آسمان کی کروٹ نے حضرت یوسف عم کو عزیز مصر کر دکھایا۔ اسی آسمان کی ایک ایک کروٹ میں نادر۔ تیمور چنگیز خاں وہلاکو سی بے گنتی کٹ پتلیاں نکل پڑیں۔ پھر ایسی غائب ہوئیں کہ مہ و خورشید کی عینک سے بھی نظر نہ آئیں۔

اور تماشے تو اگر دو چار دفعہ دیکھئے یا ایک ہی تماشا دیر تک دیکھتے رہئے تو اجیرن ہو جاتا ہے، بر خلاف اس کے آسمان کی شعبدہ بازیاں ہمیشہ دلچسپ ہی دیکھ لیجئے۔ محبت کے افسانوں میں ابروئے خمدار کے مارے ہوئے اس قدر

نکلیں گے جتنے کسی تاریخ میں تلوار کے مارے نہ نکلیں گے۔ چرخ نیلوفری نے ایسے رنگ بدلے ہیں کہ کسی رنگریز کے فرشتوں نے نہ دیکھے نہ سُنے۔ نادر ذرا رنگ لایا تھا کہ ؎

بیک گردش چرخ نیلوفری
نہ نادر بجا ماند نے نادری

دنیا میں آج تک کسی نے نہ جانا کہ یہ تماشا کب سے ہو رہا ہے اتنا دکھائی دیتا ہے کہ جس طرح مداری گولیاں اُڑا کر ایک دو کو انگلی کے اشارے سے کہہ دیتا ہے کہ وہیں تھم جا۔ اسی طرح انسان کی زندگی ہے کہ دم بھر کو ٹھہری دکھائی دیتی ہے ؎

انھیں کیا حکم ہے ضبطِ محبت
کچھ آنسو آ گئے ہیں چشم تر تک

چرخ کج رفتار کی کج رفتاری کوئی نئی بات نہیں۔ حسین بھی اِٹھلا کر چلتے ہیں اور بُرے نہیں لگتے۔ مگر آسمان کی رفتار عجیب ہے کہ خدا جانے کب سے یہ چال چل رہا ہے اور آج تک تھکا نہیں۔ نہ اس بات کے آثار ہیں کہ کبھی تھکے گا۔ خوبانِ جہاں نے ستم شعاری میں گو آسمان کی نقل تھوڑی بہت اُڑائی مگر ان سے نبھی نہیں کہ زیادہ عمر ہوئی نہیں اور جفا شعاری بیکار گئی نہیں۔ پر گردوں کی عمر جس قدر زیادہ ہوتی جاتی ہے اُس کی جفا پیشگی میں کمی تو کیا ترقی ہی نظر آتی ہے۔ حسینوں کے ظلم کی سند آسمان سے نہ لی جائے تو شاعر تشبیہ دینی چھوڑ دیں خوئے یار پر چاہنے والے اس لئے مرتے ہیں کہ چرخِ ستمگر سے ملتی ہے۔

دُنیا میں کوئی تماشا اس قدر عبرت انگیز نہیں دیکھا جس قدر کہ گردشِ دوراں کا۔ باغ میں بجلی اُس وقت گرتے دیکھی جب کہ مرغِ چمن نے خس و خاشاک سے آشیاں بنا کر ذرا آرام کرنے کا ارادہ کیا ؎

صبا بھٹکا کئے آئے تو اس دم
جب آتش لگ رہی تھی آشیاں کو

کھیت پک کر تیار ہوا کہ ٹڈی آپڑی۔ منزل دو قدم رہ گئی کہ پاؤں جواب دے گئے۔ ایک عمر کی تلاش کے بعد یار ملا تو اظہارِ مدعا کیسا؟ زبان ہی بند ہوگئی۔

لیکن سب سے بڑا تماشا چرخ شعبدہ باز کا ہمارا مرنا اور قیامت کا اٹھنا ہے میں اس کو تماشا اس لئے سمجھتا ہوں کہ اہلِ نظر کی نگاہ میں یار کی ہر ادا پر مرنا ضرور ہے اور قیامت تو خرامِ ناز سے بپا ہوتے شاعروں نے ہزار بار دکھا دی۔

عاقبت کا خیال مجھے اس لئے زیادہ پسند ہے کہ اگر واقعی نہ ہو تو اس کو غلط سمجھنے کی ہمت کسے ؎

گئی گر فصلِ گل، ہے ابر موجود
ابھی کیا آپ میں آنے کے دن ہیں

جس سے نگاہِ یار پھرے یا آسماں کی طرح کسی کا سر پھرے تو مرنے کے بعد جو کچھ ہونے والا ہے اُس میں شبہ کرے۔ یہ وعدۂ جاناں نہیں کہ ابھی کہا اور ابھی پھر گئے۔

چرخ کی شعبدہ بازیوں میں ایک خصوصیت ہے جو دنیا کے اور

شعبدوں میں نہیں اور شعبدہ بازوں کے کھیل ختم ہونے پر لوگ ہنستے خوش ہوتے اٹھتے ہیں۔ چرخ شعبدہ باز کے جتنے کھیل تماشے ہیں سب کا انجام رونے پر ہے۔ چاہنے والے جو سب میں زیادہ باؤلے ہیں۔ یہی کہتے چلے گئے ؎

یہ دو دل کو یک جا بٹھاتا نہیں

کسی کا اسے وصل بھاتا نہیں

کسی کی تمنا اگر بعد از خرابی بسیار بر آئی ہو تو کب کہ جب لطفِ آرزو نہ رہا۔ قیس کو جیتے جی لیلیٰ نصیب نہ ہوئی۔ نعش پر ماتم کرنا قسمت میں لکھا تھا۔ شیریں کو فرہاد کی محبت کا جوش اس وقت ہوا جب کہ فرہاد سر پھوڑ چکا تھا۔ یوسف کو زلیخا اس وقت یاد آئی جب کہ زلیخا اپنی جوانی سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی اور حضرت جامی نے اسے دوبارہ جوان بنایا۔ مگر وہ بات پھر میسر نہ ہوئی کہ زنانِ مصری نے جو زلیخا کو عشقِ یوسف پر ملامت کرتی تھیں۔ بیہوشی میں اپنے ہاتھ کاٹ لئے اور خبر نہ ہوئی ؎

مستوں نے ترکِ مے کی قسم کھائی بھی تو کیا

توبہ کہاں وہ بات جو مستی چلی گئی!

صوفیائے کرام کا قول ہے کہ ازل میں سب سے پہلے حرفِ عشق پکارا گیا۔ مجھے اپنے مضمون کی دھن میں خیال آیا کہ عالمِ اسباب میں مادرِ گیتی کے پہلے بچے کے کان میں اذان کی جگہ چرخ شعبدہ باز نے یہ پھونک دیا کہ "بڑے بڑے کھیل تماشے" اور اپنا پٹارہ سامنے بیٹھا۔ اب دنیا ہے کہ دیکھنے چلی آتی ہے اور محو تماشا ہے۔ وہی آواز ہر شخص کے کانوں میں گونج رہی ہے۔

خیال بمقابلہ زبان

خیال وہ چیز ہے جو ذہن میں آئے اور زبان اس کے اظہار کا طریقہ ہے۔ زبان اچھی ہو تو کیا کہنا۔ اگر اچھی نہ ہو تو بھی اگر خیال اچھا ہے تو اُجڑے گھر کا چراغ ہو جاتا ہے ؎

وہ داغ دیکھ کے بولے دلِ شکستہ کا
اُجڑ گیا ہے یہ گھر اور چراغ جلتا ہے

ہماری زبان کی نسبت مدت سے یہ شکایت چلی آتی ہے کہ اس میں مشکل مضامین کے ادائے بیان کی گنجائش نہیں "صلائے عام" نے اگر کچھ نہیں کیا تو اتنا ضرور کر دکھایا کہ مشکل سے مشکل مضمون بھی اس خوبی سے بیان کئے جاتے ہیں کہ بے تقاضا پڑھنے کو جی چاہتا ہے ؎

الٰہی کس نے کہا ہے نہ بولنا ہم سے — کہ آج دل کی طرح سے ہے بیقرار زبان
اجازت آپ جو دیں دوڑ کر کلام کرے — کرے نہ جنبشِ لب کا بھی انتظار زبان

یہ خوبی تو زبان کی سمجھ سکتا ہے، ہر شخص جو اردو جانتا ہے، شریک ہے۔ مگر "صلائے عام" میں خاص بات یہ ہے کہ اس میں خیال کی تلاش زیادہ رہتی ہے۔ زبان کے قائل تو ایسے بھی لوگ ہیں جو لیاقت علمی سے خالی ہوں۔ مگر خیال کی داد دینے کے لئے علم و لیاقت کی ضرورت ہے۔ اس لئے اہل علم و کمال میں خیال

کی خوبی کو زبان کی خوبی پر ترجیح دی جاتی ہے۔ زبان کے سمجھنے والے زیادہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ زبان کا سمجھنا آسان ہے۔ مضمون پیدا کرنے میں جو خون جگر کھانا پڑتا ہے اُس کے سمجھنے کے لئے دل و دماغ چاہیئے اور دل و دماغ بخت عرفی کی طرح

جہاں بگشتم و دردا بہ ہیچ شہر و دیار
نیافتم کہ فروشند بخت در بازار

ہر گھڑی ہر وقت بازار میں نہیں ملتے۔

یہی وجہ ہے کہ عوام میں اندر سبھا کی غزلیں زیادہ زبان زد دیکھئے گا اور عرفی کے قصیدے کم۔ جو لوگ عوام کی زبان اختیار کریں جلد مشہور ہو جائیں گے، خاص کی زبان دیر میں سمجھ میں آوے گی۔

اردو لٹریچر میں ازروے زبان بہت کچھ لکھا گیا مگر اساتذہ کو چھوڑ کر دیکھئے تو اس شاعری میں اب صرف زبان کا لطف رہ گیا ہے۔ نیا مضمون نکالنا شب ہجر کا کاٹنا ہے۔ نثر میں فسانۂ عجائب اور اردوئے معلّٰی پر اپنے اپنے طرز کی خوبیاں ختم ہیں کہ ان سے بہتر کیا کوئی لکھے گا۔ لیکن اردو کا سارا لٹریچر دیکھ جائیے۔ نیا خیال ذرا مشکل سے ملے گا۔ زبان کی خوبی جیسا کہ میں عرض کر چکا بڑی چیز ہے۔ مگر خیال کی خوبی اس سے بھی اچھی چیز ہے۔ خیال کو کسی حسین سے تشبیہ دیجئے تو زبان محض آرائش لباس سے زیادہ نہیں سمجھی جائے گی۔ دنیا کی پاکیزہ زبانوں میں بڑی ضرورتِ خیال کی سمجھی جاتی ہے۔ اس کے بعد انداز بیان کی۔ نظم میں تشبیہ و استعارے میں ہم نے وہ کمال پیدا کیا کہ یہ کمال ہماری زبان کا حصہ ہو گیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی پابندیاں ایسی لگا دیں

کہ وہی خوبی ہزار بار دکھائی گئی۔ یہاں تک کہ دیکھتے دیکھتے ہماری نگاہ میں اجیرن معلوم ہونے لگی۔ علاوہ اس کے نظم میں جب ہم اس قدر دل و دماغ صرف کر بیٹھے تو اب نثر کے لئے کیا رہ گیا۔ یہ میں پہلے کہہ چکا اور پھر کہتا ہوں کہ زبان کی خوبی یہی نہیں ہے کہ اس کا روزمرہ بے عیب ہو۔ خیال بھی پاکیزہ چاہیئے۔ اردو لٹریچر میں مجھے زبان کی شکایت نہیں۔ شکایت ہے تو خیال کی کہ خیال بہت ہی معمولی ہوتے ہیں۔ لڑائی ہوتی ہے تو دہلی اور لکھنؤ کے محاوروں پر۔ یہ فکر نہیں کہ جو کچھ خیال میں ہے یہ بھی زبان سے نکالنے کے لائق ہے یا نہیں۔ دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں جو فرق میرے ذہن میں آیا یہ ہے کہ دہلی میں سقہ جو نل سے مشک بھر رہا ہے دوسرے سقّے سے جس زبان میں باتیں کر رہا ہے اُسی زبان میں لال قلعے تک باتیں سنتے چلے جائیے۔ اس لئے دہلی کی زبان میں بے تکلفی ہے۔

لکھنؤ میں خاص کی زبان اور، اور عوام کی زبان اور ہے جو تکلف سے خالی نہیں۔ مگر خیال میں نہ یہاں کی کوئی بات دیکھی نہ وہاں۔ ساری فسانۂ عجائب دیکھ جائیے یہ نہیں یاد رہتا کہ نیا مضمون کون سا تھا، اور ساری اُردوئے معلّیٰ پڑھ کر یہی یاد رہا کہ میاں تمہارا خط نہیں آیا۔ تم کیسے ہو کیا کر رہے ہو؟ برخلاف اس کے اور ملکوں کی زبانوں میں خیال کی فکر زیادہ رہتی ہے کہ ہر بات میں نیا مضمون پیدا ہو۔

آئینہ کو ہم حیران باندھنے سے زیادہ نہ کہہ سکے۔ یونان کے کسی شاعر نے اس میں ایک نئی بات پیدا کی کہ کوئی حسین جس کی جوانی کا انحطاط قریب

ہے۔ زہرا کے مندر پر آئینہ چڑھانے گئی۔ چڑھاتے وقت کہتی کہ آئینہ کی اب مجھے ضرورت نہیں جیسی میں تھی وہ صورت تو اب آئینہ میں کاہے کو نظر آئے گی۔ جو شکل ہونے والی ہے اس کو دیکھ کر کیا کروں گی۔ جوانی کے بعد جو میری صورت ہوگی وہ مجھ سے نہیں دیکھی جائے گی۔ جیسی تھی پھر دکھائی دے چکی ؟ اب آئینہ کو رکھ کر کیا ہوگا یہی آئینہ جو حسینوں کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا جوانی کے بعد اس کی شکل سے نفرت ہو جائے گی۔

ایک کم سن لڑکی جو اب تک گڑیوں سے کھیلتی رہی صغر سنی کی شادی میں از روئے رسم مندر میں پوجا کرنے کے لئے گئی اور لوگ چڑھاوے کی چیزیں لے گئے تو یہ اپنی گڑیاں ساتھ لیتی گئی کہ اب ان سے کھیل کی۔ ان کو چڑھانے کے لئے لائی ہوں۔ دیبی جی جن کو گھر کے جھگڑوں سے فرصت ہے گڑیوں سے کھیلیں گی۔ شادی کے بعد کھیلنا معلوم۔

یونان میں رسم تھی کہ لڑکے کے بالغ ہونے تک سر کے بال نہیں منڈائے جاتے تھے۔ مونڈن کے وقت ماں باپ نے سر کے بال درگاہ پر چڑھاتے وقت کہا کہ سیاہ بالوں کے عوض اسے خدا اتنی عمر دے کہ اس کا سر سفید ہو جائے۔

عقل نے عشق سے کہا کہ اکیلی تو میں تجھ سے لڑنے کو تیار ہوں کہ ایک کی لڑائی ایک سے برابر کی لڑائی ہے۔ مگر تیرے ساتھ اگر دختر رز ہو گئی تو پھر تیرا مقابلہ مشکل ہے۔

حسن وفا کے بغیر بیکار ہے کہ مچھلی کے شکار میں نری بنسی سے شکار

نہیں ہو سکتا۔ کانٹا نہ ہو تو بنسی پانی کے اوپر تیرا کرے گی اور مچھلیاں با خبر نہ ہوں گی۔

ایک نوجوان راہ خدا کے شہید کے مزار پر پھول پان چڑھانے لے گیا۔ قبر سے آواز آئی کہ اے احمق یہ چڑھاوا ہمیں نہیں چاہیئے۔ اسے واپس لے جا۔ یہ چیز کسی شاہد بازاری کو دے دینا۔ یہاں ڈھال تلوار چاہیئے جو بازار سے خریدی ہوئی نہیں بلکہ خدا کی راہ میں کام آئی ہوئی ہو تو لے آ۔

کھیت نے زمیندار سے کہا کہ تجھ سے پہلے میں تیرے باپ کا تھا اب تیرا ہوں۔ تیرے بعد تیرے بیٹے کا۔ پھر پوتے کا اور پرپوتے کا تو مجھے اپنا موروثی سمجھتا ہے۔ تیرے بعد بیٹے نے اگر بیچ ڈالا تو دوسرے کا ہو جاؤں گا مگر یہ سب اپنی بیوقوفی سے مجھے اپنا سمجھتے ہیں اور سمجھتے رہیں گے۔ میں نہ تیرا ہوں نہ کسی کا۔ نصیب کا اور بخت کا زر خرید غلام ہوں۔

جو نعمتیں کہ انسان کے لئے مناسب ہیں، مانگے اور بے مانگے خدا دیتا ہے جو ہمارے لئے مضر ہیں، مانگنے سے بھی نہیں دیتا۔ یہ نہ دینا اس کی عین رحمت ہے۔

انسان اپنی زندگی اس طرح بسر کرے کہ انتظام میں یہ سمجھے گویا کبھی مرنا ہی نہیں اور آرام میں یہ سمجھے کہ کل کی بھی امید نہیں۔

نیکی کے آغاز میں پہاڑ اور گھاٹیاں اور ہزاروں نشیب و فراز ہیں جو نہایت دشوار گذار ہیں۔ مگر ان سے اترتے ہی آرام کے دروازے تک تمام راستہ صاف ہموار پڑا ہوا ہے کہ آنکھیں بند کئے چلے جائیے۔

ایک خونی کسی دیوار کے نیچے سو رہا تھا۔ خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ کوئی اُس سے کہہ رہا ہے کہ یہاں سے بھاگ۔ اُس کی آنکھ کھل گئی۔ وہاں سے اٹھ کر بھاگا۔ اُس کے بھاگتے ہی دیوار گری۔ اس نے اپنے دل میں کہا کہ خدا نے مجھ پر بڑا رحم کیا کہ گرتی دیوار سے بچا لیا ورنہ دب کر مر جاتا۔ آواز آئی کہ ہم نے اس موت سے اس وقت تجھے بچا لیا کہ یہ آسان تھی۔ تجھے اُس تکلیف کی موت سے سب کے سامنے مارنا منظور ہے جسے پھانسی کہتے ہیں۔ دیوار سے دب کر مرنا مرگ ناگہاں میں سمجھا جاتا۔ تیرے اعمال کی سزا میں مارنے کے لئے تجھ کو چھوڑا ہے تاکہ جلاد کے ہاتھ سے مارا جائے۔

ایک بچے کی قبر پر کندہ ہے کہ میرے ماں باپ میرے لئے نہ روئیں کہ اگر میں نے زندگی کا لطف نہیں دیکھا تو اس کی مصیبتیں بھی نہیں اٹھائیں۔ ادھر کی کسر اُدھر نکل گئی۔

کسی کے غم میں موت سے کوئی کہہ رہا ہے کہ تو مرنے والے کے ساتھ تو زبردستی کر گئی بھلا میرے ساتھ تو کر کہ مرنے والے کی یاد چھین تو لے۔

دنیا میں ہم فانی ہیں تو جو کچھ ہم سے متعلق ہے وہ بھی فانی ہونا چاہیئے کہ جوہر اور عرض کا ساتھ ہے۔ مگر لطف یہ ہے کہ اگر سامان رہ بھی جائے تو ہم نہیں رہ سکتے۔ یہ نئی بات ہے کہ جوہر ندارد اور عرض قائم۔

مجھے اُن پر افسوس نہیں آتا جو مر گئے۔ اُن پر افسوس آتا ہے جو مرنے کے نام سے ڈرتے ہیں۔

پیری اور شباب! مجھے اپنے اوپر افسوس آتا ہے کہ میں نے شباب

کو جاتے اور پیری کو آتے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

پروردگار کی نعمتیں عجیب و غریب ہیں۔ آسمان اور زمین۔ سورج اور چاند۔ دریا اور پہاڑ اور جنگل اور ہوا یہ کسی کو دغا نہیں دیتے۔ دغا دیتی ہیں تو انسان کی آرزوئیں کہ ایک بھی اس کی مرضی کے موافق پوری نہیں ہوتی۔ تو مرا۔ پھر تیرا کچھ نہیں۔ جو تیرے پیچھے رہ گئے اُن کا سب کچھ ہے نصیب وتمنار خصت' میں منزل پر پہنچ گیا۔ تم نے مجھے بہت بہکایا۔ میں تمہارے پیچھے پھرتے پھرتے تھک گیا اور اب اوروں کی باری ہے۔ اوروں کو دام فریب میں لاؤ۔

یہ چند خیال میں نے اہل علم کی طبع آزمائی کے لئے جمع کر دیئے کہ ان پر مضمون لکھیں۔ یہ خیال نظم کی خوبیاں مانگتے ہیں جن سے میں عاری ہوں۔ شعرائے اردو ان کو نظم میں ادا کریں تو ان کا لطف دوبالا ہو جائے میں نے بُری بھلی اردو میں ان کا مطلب ادا کر دیا۔ آپ جانیں اور آپ کی نازک خیالیاں۔

طوفانِ حیات کا ایک ورق

صادقہ بڑے باپ کی بیٹی تھی اونچے گھر میں بیاہی گئی۔ ماں باپ کی چہیتی تھی، ساس سسروں کی عزیز ہوئی۔ میکے کی سرتاج تھی، سسرال میں راج کیا۔ تین سال شاندار زندگی بسر کرنے کے بعد پے درپے کچھ ایسے اتفاقات پیش آئے کہ امارت تو درکنار دانت کرید نے کو تنکا تک نہ رہا۔ انعام اس کے چچازاد بھائی کو علم نہ تھا کہ ایک گھر پر حکومت اور خاندان پر سلطنت کرنے والی بیگم آج دو دو دانوں کو محتاج ہے۔ گھر پر جاکر آواز دی تو معلوم ہوا کہ گلی میں رہتی ہے۔ وہاں گیا تو ٹوٹی ہوئی کچی دیواریں اور پرانے کواڑ مصیبت ماری بہن کی غربت کا پتہ دے رہے تھے۔ کنڈی کھٹکھٹائی تو ایک عورت نے دراڑوں میں آکر جھانکا اور کہا "اندر آجاؤ" اندر گیا تو عجیب سماں تھا۔ ماں باپ کی پیاری اور سسرال کی راج دلاری اس ٹوٹے ہوئے کھنڈر میں زندگی بسر کر رہی تھی۔ میلے چکٹ کپڑے، جابجا پیوند، چاروں طرف سے دوپٹہ سمیٹ کر اوڑھ کہ پاجامہ کے پیوند ظاہر نہ ہوں اور سلام کو جھک گئی۔ انعام نے تین برس بعد صادقہ کو دیکھا۔ اس کا اگلا دور دورہ اور عروج آنکھوں کے سامنے تھا۔ کل کی بات تھی کہ گوندنی کی طرح زیور میں لدی، اعلیٰ اور نفیس لباس پہنے۔ تین تین چار چار مائیں آگے، راج کر رہی تھی۔

آج وہ سماں کوسوں دور تھا اور اس عیش کی یادگار صرف وہ دیکھنے والے رہ گئے تھے جنہوں نے انقلاب کی اس تصویر کا اقبال اس طرح پامال ہوتے دیکھا۔ دو پونے دو برس کا ایک بچہ گود میں تھا اور یہ ننھی سی جان خدا کی شان یاد دلا رہی تھی کہ جس کی پیدائش پر بیسیوں جوڑے غربا کو تقسیم ہوئے اب کڑکڑاتے جاڑوں میں صرف آفتاب اس کے جسم کو سردی سے بچاتا تھا۔ چاہتی تھی کہ پان بنا کر بھائی کو دوں مگر خیال آیا کہ خود ہی شام سے خالی زردہ کھا رہی ہوں۔ پٹاری میں پان اللہ کا نام ہے۔ اس وقت صادقہ کی حالت عجیب تھی ندامت کے مارے زمین میں گڑی جاتی تھی۔ آنکھیں نیچی، زبان بند، ہاتھ پاؤں ساکت ایک بے جان جسم تھا جو سامنے کھڑا تھا۔ دو منٹ یہی حالت طاری رہی اور انعام نے کہا۔

"یہ تمہاری حالت میں کیا انقلاب ہو گیا۔ سید صاحب کہاں ہیں؟"

صادقہ "ان کا انتقال ہو گیا۔ مقروض تھے جو کچھ چھوڑا سب قرض میں چلا گیا"

انعام "مجھے تو اس کا علم ہی نہیں"

صادقہ "اپنی اپنی پریشانیوں میں سب گرفتار رہتے ہیں۔ کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ دوسروں کی پریشانیاں معلوم کرے۔ آپ کے ہاں سب خیریت ہے؟"

انعام "ہاں خدا کا شکر ہے کہ آج تمہاری بھابھی جان کی گود بھرائی ہے۔ تمہیں لینے آیا ہوں"

صادقہ۔ خدا مبارک کرے میں نہایت خوشی سے چلتی لیکن اب میں اس قابل نہیں رہی۔ اتنا کہہ کر صادقہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے مگر ضبط کیا اور کہنے لگی انشاء اللہ اور کسی موقعہ پر شرکت کی کوشش کروں گی۔

انعام "میرا جی یہ چاہتا ہے کہ تم آج ہی شریک ہو۔ تھوڑی دیر کے لئے چلی چلو۔ ایسا ہی ہے تو شام کو چلی آنا"

صادقہ "دیر کا خیال نہیں ہے۔ کچھ اور سبب ہیں جن کی وجہ سے میں آج اس وقت مجبور ہوں"

انعام "تم یقین کرو تمہاری شرکت سے مجھے بے حد خوشی ہو گی اور تمہارا انکار مجھے اس مسرت سے محروم کرتا ہے جس کی میں تم سے توقع رکھتا ہوں"

صادقہ "حقیقت یہ ہے کہ جس شخص نے عمر بھر کی رفاقت کا وعدہ اور ہمیشہ ہمیشہ کی نباہ کا اقرار کیا تھا اس کی مفارقت میری تمام امیدوں کو ختم کر گئی۔ خدا اس کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، میرے دل میں اب کوئی ارمان باقی نہیں۔ ہاں میرے چلنے سے اگر آپ کو خوشی میسر آسکتی ہے تو میں بسر و چشم حاضر ہوں۔ جس طرح بیٹھی ہوں چلی چلوں گی، مگر انعام بھائی تمہارے سسرال کے لوگ بھرے ہوں گے، میرے اس طرح چلنے سے آپ کی بے عزتی ہو گی۔ میرا خیال نہ کیجئے آپ اپنی عزت اور بے عزتی کو سوچ لیجئے۔

انعام "کیا کہہ رہی ہو صادقہ! تمول اور ذلت انسان کے واسطے وجہ عزت نہیں، تم تمام خاندان کے واسطے مایۂ ناز ہو کہ باپ دادا کی لاج

اور بڑوں کی آن بان لئے بیٹھی عزت آبرو سے زندگی بسر کر رہی ہو۔ میں ڈولی لاتا ہوں۔ تمہارے چلنے سے ہمارا گھر منور ہو جائے گا اور یہ چھوٹی سی شادی یقیناً تم جیسی خاتون کی شرکت پر فخر کرے گی۔"

صادقہ اپنے بوسیدہ مکان سے چل کر بھائی کے یہاں پہنچی تو کیا دیکھتی ہے کہ عالی شان محل سرا بیویوں سے کھچاکھچ بھری ہے۔ سونے چاندی کے زیور کھوٹے چھپے کے کپڑے چاروں طرف جگمگا رہے ہیں۔ ٹیپ ٹاپ اور زرق برق پوشاکوں نے گھر بھر کی رونق دوبالا کر دی ہے۔ صادقہ اس آرائش ظاہری سے قطعاً محروم تھی مگر اس کی روح مسرت حقیقی سے لبریز اور دل عارضی جلوؤں پر ہنس رہا تھا۔ بھاوج کی طرف سلام کو چلی مگر کپڑے میلے تھے، جواب تو مل گیا لیکن کوئی اور نہ ملا۔ بچہ کو لئے باہر انگنائی میں ایک پرانے تخت پر بیٹھ گئی۔ کھانے کا وقت آیا تو کیسی خاطر اور کس کی مدارات کسی نے جھوٹوں بھی بات نہ پوچھی۔ بھاوج کی اس غفلت کا احساس فطرت تھی مگر اس کے سوا چارہ کیا تھا کہ جب بچہ بھوک سے بے تاب ہو کر زیادہ پھڑکا تو بہلا کر سلا دیا اور خاموش ہو گئی۔ دن بھر مارا مار پیر جی کا جوڑا تیار ہوا۔ شام کو گود بھرائی ہوئی تو باجرہ کی بڑی بہن کی چار سال کی بچی کے دونوں دمکتے ہوئے سونے کے کڑے کسی نے صاف تیر کر دیئے۔ گھر بھر میں ڈھنڈیا مچ گئی۔ کونہ کونہ اور چپہ چپہ دیکھ ڈالا مگر بیس تولے کے کڑے سوئی تھوڑی ہی تھے کہ چھپ جاتے۔ دفعتہً پیر کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا تو سب بیویاں جدھر جس کا منہ اٹھا، کونے کھدروں میں جا گھسیں پیر جی آئے تو دسترخوان بچھنے کی تیاریاں ہوئیں لیکن انھوں نے منظور نہ

کیا اور کہا:۔

"میں تو صرف آدھی رات کو ایک ٹکیا جوار کی کھاتا ہوں۔ تم لوگوں کا اصرار تھا اس لئے آ گیا۔"

ہاجرہ کی ماں:۔ "ہمارا تو منہ نہیں کہ حضور کا شکریہ ادا کریں۔ آپ ہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے کہ خدا نے یہ دن دکھایا۔ ہم تو ناامید ہو چکے تھے۔ اب دیا ہے تو عمر کا دیجئے گا۔ چراغ کا جو حضور نے حکم دیا تھا جلا دیا ہے۔"

پیر جی:۔ "سب دیکھ لی جائے گی۔ تم لوگ پہلے تو احتیاط کرتے نہیں پیچھے ہم کو ستاتے ہو۔ ہم کو ہاجرہ کے علاج میں بہت دقت ہوئی۔ بڑی مشکل سے ظالم قبضہ میں آیا ہے۔"

ہاجرہ کی ماں:۔ "خدا حضور کی عمر دراز کرے۔ ہماری تو اگر کھال کی جوتیاں بھی حضور پہنیں تو عذر نہیں۔ یہ کپڑے حضور کے لائق تو نہیں ہیں مگر ہمارا دل بڑھ جائے گا۔"

پیر جی:۔ "اچھا اگر تمہاری یہی خوشی ہے تو خیر کسی نہ کسی کے کام آ ہی جائیں گے۔"

ہاجرہ کی ماں:۔ "حضور آج ایک اور واردات ہو گئی۔ ابھی ابھی حضور کے آنے سے ذرا پہلے کسی کم بخت نے بچی کے کپڑے اتار لئے۔ کس نے کیا؟ ہم کو خود اچھی طرح معلوم ہے۔ اب حضور وہ نکلوا دیں۔"

پیر جی۔ (کچھ تامل کے بعد) "ابھی تو کپڑے اس کے پاس موجود ہیں اس سے کہہ دو کہ اگر ہنسی خوشی نہ دے گی تو نہس نہس کر دوں گا۔ کیوں تم ایسے چوروں کو گھر میں گھسنے دیتے ہو۔"

ہاجرہ کی ماں:۔ "حضور سگے چچا کی بیٹی ہے اس لئے بلا لیا تھا صادقہ اری صادقہ! یہاں تو آ۔ حضور فرما رہے ہیں کہ اگر سیدھی طرح کپڑے نہ دیئے تو غارت کر دوں گا۔"

پیر جی:۔ "ایک کوری بدھنی پانی بھر کر لاؤ۔ کاغذ، قلم، دوات دو اور

سب مہمانوں کے نام لکھوا دو میں ابھی چور کا نام نکال دیتا ہوں؟
پانی بھری ہوئی بدھنی ایک طرف سے پیر جی نے دوسری طرف سے انعام نے انگلی پر رکھی اور پیر جی کچھ پڑھتے گئے۔ ٹونٹی میں ایک ایک کر کے ناموں کے پُرزے ڈالتے جاتے تھے۔ ایک نام پر بدھنی نے گردش کی۔ پرزہ نکال کر دیکھا تو صادقہ کا نام تھا۔ پیر جی کی فال اور کچھ چوری چھپے نہیں، سب کے روبرو اور ہر ایک کے سامنے۔ اب صادقہ کو چور سمجھنے میں کیا کسر رہ گئی تھی۔ یقین کامل ہو گیا۔ اپنے اپنے طور پر سمجھا کر ڈانٹ کر، ڈپٹ کر، غصہ سے، پیار سے، جس سے جس طرح ہو سکا کڑوں کو نکلوانے کی کوشش کی۔ جب کامیابی نہ ہوئی تو خود انعام نے کہا:۔

"صادقہ! دو چار روپیہ کا مال ہوتا تو مضائقہ نہ تھا۔ چار ساڑھے چار سو کے کڑے ہضم کر لینے آسان بات نہیں ہے۔ میں خدا سے ڈر کر اور تم پر رحم کھا کر لایا تھا۔ یہ خبر نہ تھی کہ تم اللہ کی عنایت سے سب گنوں پوری ہو اور ایسا کلیجے میں ہاتھ ڈالو گی کہ سب تڑپتے ہی رہ جائیں گے۔ اتنا کچھ کہا جا رہا ہے اور تم پر خاک اثر نہیں ہوتا۔ یہ میں جانتا ہوں کہ کچی نہیں دھاڑی چور ہو۔ بھلا موقعہ نہیں کہ ڈرانے میں آجاؤ گی مگر یاد رکھو میں بھی داروغہ ہوں۔ دم بھر میں اگلوا لوں گا۔ ابھی تو مُنہ ہی سے کہہ رہا ہوں پھر تم جانتی ہو میرا غصّہ کیسا ہے۔ اب بھی کچھ نہیں گیا۔ کسی بہانہ سے ادھر ادھر ڈال دو۔ آئندہ تم کو اختیار ہے۔

صادقہ کو اس وقت دین و دنیا کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔ آنکھیں نیچی

تھیں جن سے زار و قطار آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کی گود میں بچہ تھا جو بے خبر پڑا سوتا تھا۔ وہ ساکت تھی، خاموش تھی اور بس نہیں چلتا تھا کہ زمین میں گڑ جائے۔ سینکڑوں بیویوں کی نگاہیں اس کے چہرہ پر تھیں اس کی حالت ظاہری، اس کے میلے کچیلے کپڑے، اس کا افلاس و مصیبت چوری کا پورا یقین دلا رہے تھے۔ اس کے دل میں رہ رہ کر جوش اٹھتا تھا اور وہ سوچتی تھی اب اس سے زیادہ نازک وقت اور مصیبت کا دن کیا ہوگا۔ شوہر گیا، دولت گئی، چین گیا، آرام گیا، پہننے کو چیتھڑا نہ رہا، رہنے کو تھگلی نہ رہی، ماں باپ ساس سسرے سب رخصت ہوئے ایک تھوڑی سی آبرو باقی تھی آج وہ بھی چلی۔ جو لوگ عیش کرتے دیکھتے تھے، جن آنکھوں نے گھروالی اور بااختیار دیکھا تھا، اب ان کے سامنے چور بنی کھڑی ہوں۔ اللہ اللہ کیسا درد انگیز سماں ہے! دفعتہً اس نے آنکھ اوپر اٹھائی انعام کی طرف دیکھا اور کہا۔

"کچھ شک نہیں خدا نے آپ سب کو جو عزت دی ہے میں اس وقت اس سے محروم ہوں۔ میری بابت جو کچھ کہا جائے ٹھیک ہے میں مفلس ہوں۔ مجھ پر ہر الزام لگ سکتا ہے۔ بے وارثی ہوں جس کا جو چاہے کہہ لے۔ آپ کے گھر پر ہوں جو کچھ سنوں درست۔ آپ کے قبضہ میں ہوں جو کہا جائے ٹھیک۔ مگر وہ بدنصیب جس نے خدا سے کیا کسی بندے سے بھی کبھی جھوٹ نہ بولا تم کو یقین دلاتی ہے کہ چھ پہر کی بھوکی صرف اس کونہ میں بیٹھی رہی۔ میں نے تمہاری خوشیاں، تمہاری رسمیں، آنکھ اٹھا کر بھی نہیں

دیکھیں۔ تم نے مجھ کو گھر پر بلا کر میری آبرو لی۔ میں بے گناہ ہوں۔ گو اس قابل نہیں ہوں کہ تمہارے برابر بیٹھ سکوں مگر چور نہیں ہوں۔ میں نے تمام عمر کبھی قسم نہیں کھائی لیکن اس وقت کہتی ہوں کہ میری بے گناہی کا شاہد صرف وہ ہے، جس کی نگاہ میں میرا افلاس اور تمہارا تمول دونوں برابر ہیں۔ سب کچھ کھو چکی، میرے سر سے وارث اٹھ گیا، میری جائداد برباد ہو لی، میری کمائی لٹ گئی، لیکن عمر بھر کی پونجی، زندگی کا سرمایہ، دنیا کی کل کائنات، صرف یہ ایک معصوم لال میری گود میں ہے۔ تم صاحب اولاد ہو میری مامتا کی قدر کرو۔ میں اس بچہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہوں، میں نے تمہارے کڑے نہیں لئے۔ میں جب سے آئی ہوں تمہارے گھر سے باہر نہیں نکلی۔ میں تنہا ہوں، میرا بچہ بغیر مدد کے چل بھی نہیں سکتا۔ تم میری تلاشی لے لو اور اس جرم کی سزا دو کہ جب میں اس لائق نہ رہی تھی تو کیوں تم لوگوں کی خوشی میں شریک ہونے کی خواہش مند ہوئی۔ مجھ کو گھر سے نکال دو۔ میرے پاس کچھ نہ تھا۔ ہاں یہ تھوڑی سی عزت باقی رہ گئی تھی وہ یوں ختم ہو گئی۔ باپ دادا کی وقعت، بزرگوں کی آن، شوہر کی لاج، سسرال کی عزت اس وقت مجھ بدنصیب نے گنوا دی۔ میری مصیبت ہمدردی کی محتاج ہے۔ اپنے بچوں کا صدقہ مجھ کو اب زیادہ رسوا نہ کرو۔ اگر تمہارا ظلم صرف میری ذات تک رہتا تو شکایت نہ تھی۔ تم نے اس بے زبان پر، اس ننھی سی جان پر، اس معصوم روح پر ستم توڑا۔ اگر یہ زندہ رہا تو اس کی عمر برباد ہوئی۔ عزیز اس سے نفرت کریں گے۔

دوست اس پر لعنت بھیجیں گے اور ماں کی چوری اس کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہو گی۔ تم بااختیار ہو، قدرت رکھتے ہو، عزت رکھتے ہو خدا نے تم کو دولت دی، حکومت دی، اطمینان دیا، راحت دی۔ جس نے تم کو خوشی کا دن دکھایا اسی کا واسطہ دیتی ہوں، میرے درپے نہ ہو۔ میں دنیا کی بدترین مخلوق اور انقلاب کی بہترین تصویر ہوں۔ میرا دل زخمی ہے، میرے زخم ہرے ہیں۔ میرا کلیجہ چھلنی ہے، میرے داغ تازے ہیں۔ میں بے بس ہوں، بے کس ہوں، دکھیاری، مصیبت کی ماری۔ میری حالت قابل رحم ہے، مجھ پر رحم کرو۔ مالک ہو، مختار ہو، کہہ سکتے ہو، تمہاری عنایت و کرم کی محتاج ہوں، بے قصور ہوں۔ میں نے تمہارے کڑے نہیں دیکھے۔ انعام بھائی میرے وارث شرعی ہو۔ خدارا مجھ کو بچاؤ۔ اس مصیبت سے نجات دلواؤ، میری مشکل آسان کرو۔ اللہ تم پر رحم کرے گا۔ میں عہد کرتی ہوں کہ آج کے بعد اب کہیں آنے جانے کا نام نہ لوں گی۔ مجھ کو ڈولی لا دو۔ میں چلی جاؤں۔"

پیر جی: "کیا چاتر عورت ہے۔ قینچی کی طرح زبان چل رہی ہے۔ خدا کا کلام جھوٹا، ہم جھوٹے۔ کم بخت، چور، مکار!"

جس جس کے منہ میں جو جو کچھ آیا کہنے میں اور سنانے میں کمی نہ کی۔ بدنصیب حسرت سے ایک ایک کا منہ تکتی تھی کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ ایمان کی بھی بولے۔ مگر چاروں طرف سے لعنت و پھٹکار پڑ رہی تھی۔ گیارہ بجے کے قریب نذر و نیاز ہو چکی تو پیر جی اپنا جوڑا نقد روپیہ اور کھانا لے کر چلتے ہوئے مگر چلتے چلتے اتنا اور کہہ گئے "خدا کی شان ہے۔"

دلیوں کے ہاں بھوت مولویوں کے ہاں الیسی سپوت لڑکی پیدا ہو جو اچھے اچھے نہاڑیوں کے کان کترے! صبح تک راہ دیکھ لو، دے دے تو خیر، نہیں تو تھانہ دار کے سپرد کر دینا۔"

تھانہ دار کا نام سنتے ہی صاد قہ تھرا اٹھی۔ جانتی تھی کہ پیر جی کا حکم ٹل نہیں سکتا۔ صبح ہوتے ہی تھانہ دار آجائے گا۔ اس بکرے کی طرح جو قصائی کی آب دار چھری سے ڈر کر چاروں طرف چھپنے کی کوشش کرے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ہر طرف نگاہ دوڑاتی تھی مگر کوئی ایسا نظر آتا تھا کہ آڑے وقت میں کام آجائے۔ پیٹ میں ہول اٹھ رہے تھے۔ اٹھتی تھی ٹہلتی تھی، بیٹھتی تھی، سوچتی تھی، بیٹھتی تھی۔ خیال آیا کہ مجھ سے زیادہ بدنصیب، مجھ سے بڑھ کر بے عزت کون ہوگا۔ دنیا کو موت آرہی ہے کیسے کیسے پیارے آنکھوں کے سامنے سے اٹھ گئے اور میں کم بخت اس دن کو زندہ رہ گئی کہ باپ دادا کی ناک کاٹ دوں۔ تیری شان تجھی کو سزاوار ہے۔ جس کی پالکی پر دوہرے پردے پڑے دیکھے، اسے تھانہ دار کے سامنے برقع بھی نصیب ہوتا ہے یا نہیں۔ اوپر نگاہ اٹھا کر دیکھا تو آسمان کے موتی جگمگا رہے تھے۔ سجدہ میں گری اور گڑگڑا کر کہا "او آقا! بدنصیب لونڈی تیری حضور میں حاضر ہے۔ رات آدھی سے زیادہ گذر چکی۔ دنیا بے خبر ہے مگر تو باخبر۔ سب سوتے ہیں اور تو جاگتا ہے صبح قریب ہے اور آرہا ہے وہ وقت جب ایک غیر مرد کا آمنا سامنا اور نامحرم نگاہیں میرے چہرے پر ہوں گی۔ جس کی پرچھائیں تک نوکروں کو دیکھنی نصیب نہ ہوئی آج دنیا اس کے ساتھ یہ سلوک کرتی ہے۔ اس وقت تللون

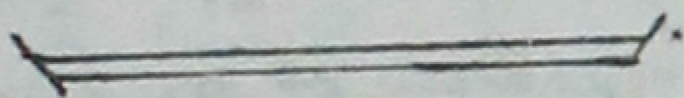
سے بچانے والا کوئی نہیں۔ مولا تیرے سامنے آئی ہوں۔ میری فریاد سن! دلوں کے حال دیکھنے والے! آنے والا وقت مجھ کو نہ دکھا۔ "اچھا، اچھا، مولا اچھا! ماں باپوں کی بیٹیاں اور عفت و عصمت کی وہ دیویاں جن کے دامنوں پر فرشتے نماز پڑھیں زندگی کی کسوٹی پر سونے کی طرح چمکیں اور کندن کی طرح دمکیں۔ صادقہ بظاہر بے وارثی، محتاج، فقیر، سب ہی کچھ تھی مگر اس کے میلے کپڑوں پر مصالحہ دار پوشاکیں قربان، اس کے افلاس پر تمول نثار اور اس کے ننگے بدن پر جڑاؤ جھالے بالے فدا تھے اس کی التجاد کھتے ہوئے دل سے نکلی اور عرش بریں پر پہنچی۔ کہتے ہیں زخمی دل کی صدا خالی نہیں جاتی۔ یہ تھا جو کچھ تھا، بھائی کی جانب سے ناامید ہو کر جب حقیقی وارث سے التجا کی تو اس کی دعا قبول ہوئی۔ بچی ہیں تھی کہ جی متلا یا، تے ہوئی، دست آیا اور ایک تین ہی گھنٹہ میں دو دن کی بھوکی مہمان کی حالت بھائی کے در پر خراب ہونی شروع ہو گئی۔ تین بجے کے قریب جب زیادہ طبیعت بگڑی اور ہلنے کی طاقت نہ رہی تو بچہ کی مفارقت کا خیال آیا۔ دل نے بے ساختہ صدا دی کہ کلیجہ کا ٹکڑا ماں کے پکھوے سے ہمیشہ کو چھوٹتا ہے۔ پرورش تو درکنار کوئی اتنا بھی نہیں کہ سر پر ہاتھ پھیر دے گا۔ کچھ عمر بھی تو نہیں۔ نگوڑا تیسرے ہی سال میں ہے۔ بات بھی تو کرنی نہیں آتی۔ آج اس کی ضدیں اور ہٹیں سب ختم ہوتی ہیں۔ ابھی میرے ہوش وحواس درست ہیں۔ ایک دفعہ کلیجہ سے لگا لوں۔ آ میری جان آ۔ پیار کی نگاہیں اور محبت بھری نظریں آج ہمیشہ کو بند ہوتی ہیں۔ چھاتی سے

لگانے والی ماں اور اس چاند سے مکھڑے پر قربان ہونے والی خدمت گذار رخصت ہوتی ہے۔ لپٹ لوں۔ لپٹالوں۔ کوئی اتنا نہیں جس کے ہاتھ میں ہاتھ دوں مگر سب سے بہتر وارث خدا ہے" پیاس کی شدت زیادہ ہوئی۔ اٹھنے کا ارادہ کیا۔ جوں توں اٹھی بھی' مگر دو ہی قدم چلی تھی کہ چکر آیا اور دھڑ سے گری۔

بیس بائیس برس کی زندگی کا نتیجہ صرف ایک بچہ تھا جو اس وقت ماں کے پاس تھا' اسی کا سہارا لے کر اٹھی اور پھر لیٹی۔ اس کے ننھے ننھے ہاتھ اٹھا کر آنکھوں سے لگائے' پیار کیا' گلے میں ہاتھ ڈال کر زور سے بھینچا۔ کہنے لگی "الٰہی زندہ رکھنا ہے تو عزت سے۔ ورنہ بے عزتی کی زندگی سے موت بہتر"

مؤذن اذان دے رہا تھا کہ دروازہ پر چند آدمیوں کی آواز آئی اور ایک شخص نے بہ آواز بلند کہا "مولانا! باہر آئیے۔ تھانہ دار صاحب آئے ہیں۔ یہ آپ کی ماما کپڑے بیچتے ہوئے پکڑی گئی ہے۔" تھانہ دار کا نام سنتے ہی صادقہ کی حالت اور بھی ردی ہو گئی۔ بھائی کو پاس بلا ہاتھ جوڑے اور کہا۔

خدا کا واسطہ مجھ پر رحم کرو میں نے تمہارے کپڑے نہیں لیے۔"



سوئٹرز لینڈ کی سیر

کیسا ہی دلچسپ مقام کیوں نہ ہو آدمی ایک جگہ رہتے رہتے اکتا جاتا ہے۔ لندن اس وقت مرجع انام ہے۔ لیکن چہار شنبہ ۸ جولائی ۱۹۰۶ء کے دن کوئی ہمارے جی سے پوچھتا کہ لندن سے جانے کی کس زور سے آرزو تھی۔ دوپہر ڈھل چکی تھی۔ دو بجنے کو تھے کہ ہم ریل پر پہنچے چند دوست ہمیں وداع کرنے آئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ ہم قابل رشک ہیں کہ سوئٹرز لینڈ کی سیر کو جاتے ہیں۔ ہم بے تاب تھے کہ گاڑی چلے۔ دو بج کر بیس منٹ گذرے اور گاڑی چلی۔ لندن سے فوکسٹن تک دو گھنٹے کا رستہ تھا۔ بارہا دیکھا ہوا تھا۔ اس کے ہرے ہرے مرغزاروں سے انگلستان میں رہتے رہتے نگاہ کافی آشنا ہو چکی تھی۔ مگر اس دن میں خدا جانے کیا جادو کی تاثیر تھی کہ وہ رستہ بھی غیر معمولی طور پر دلچسپ معلوم ہوتا تھا اور وہ اونچے نیچے کھیت جن میں بھیڑوں کے گلے چرتے پھرتے تھے نہایت دلفریب نظر آتے تھے۔ وہ تو کیا بدل گئے ہوں گے، ہماری نگاہ بدلی ہوئی تھی یا آنے والے مناظر انگلستان کی ناہموار مگر سرسبز زمین پر اپنا سایہ ڈال رہے تھے۔

فوکسٹن پہنچ کر ہم جہاز میں بیٹھے۔ حسن اتفاق سے دریا میں تموج کم تھا۔ ہنستے کھیلتے کھاتے پیتے گھنٹہ بھر میں ہم نے بولون ساحل فرانس

کو جا لیا۔ مسٹر کی جگہ موسیو! موسیو! کا شور ہے۔ فرانسیسی حمال اسباب
اٹھانے کو دوڑے آتے ہیں۔ بات بات میں سر سے پاؤں تک حرکت
کرتے ہیں۔ کچھ پوچھو تو دونوں شانے ہلا کر اس طرح "زونہ سے پا" کہتے
ہیں کہ نیچے کا ہونٹ علامت انکار کے طور پر خود بخود آگے بڑھ جاتا ہے۔
بھویں اوپر کو کھنچ جاتی ہیں۔ اور پیشانی پر دو تین شکن پڑ جاتے ہیں۔ ہم
ان کی بات سمجھیں یا نہ سمجھیں وہ اپنے مطلب کی خوب سمجھتے ہیں۔ اسباب
اٹھا کر "پہ جادہ جا" بہت عنایت کی تو اشارے سے بلاتے جاتے ہیں کہ ادھر آؤ ادھر آؤ۔ کوئی جانے
ریل پر سوار کرانے جا رہے ہیں۔ مگر نہیں۔ دوان کا قضیہ پہلے درپیش ہے فرانس میں تمباکو پر
بہت محصول ہے اور زیادہ تر اسی کی پرسش ہوتی ہے کہ کہیں اسباب میں تمباکو تو
نہیں۔ بعض دفعہ اسباب کھول کر دیکھتے ہیں۔ بعض دفعہ صرف پوچھتے ہیں۔
کوئی چیز چنگی کے قابل تو نہیں؟ اور اعتبار کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد ریل
تیار ملتی ہے اور حمال اسباب لا کر گاڑی میں رکھ دیتے ہیں۔

ہم جہاز سے اترنے کو تھے کہ ایک انگریز ہم سے مخاطب ہوا۔ اور
پوچھنے لگا "کیا آپ مالٹا کے رہنے والے ہیں؟" ہم نے کہا "نہیں ہم ہندوستانی
ہیں۔" وہ ہنسا اور کہنے لگا "عجیب بات ہے۔ اسی جہاز میں دو اور شخص ہیں
بالکل آپ کے ہم رنگ۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ ہندوستان سے آتے
ہیں۔ انھوں نے کہا نہیں ہم مالٹا کے باشندے ہیں۔ اب میں نے سمجھا کہ
آپ بھی ان کے ساتھ ہوں گے اور آپ سے پوچھا تو آپ ہندوستانی
نکلے۔ میں نے آج دو دفعہ غلطی کھائی مگر میرا کیا قصور ہے۔ آپ کے

رنگ اس قدر ملتے ہیں۔" ہم پوچھنے ہی کو تھے کہ وہ مالٹا کے آدمی کہاں ہیں کہ وہ سامنے آگئے۔ اس انگریز سے اوران سے باتیں ہو چکی تھیں۔ اس نے ہمیں ان سے ملا دیا۔ جب ہم سب وہاں سے فارغ ہو کر ریل میں سوار ہوئے تو اتفاق سے ہم اور ہمارے ہم رنگ مالٹی ایک ہی کمرے میں تھے۔ ہم نے ان سے پوچھا" آپ کہاں جاتے ہیں" انھوں نے کہا۔ لوسرن! پھر کیا تھا۔ ہم اچھل پڑے کہ راستے بھر کے لئے رہبر خدا نے بھیج دیئے۔ مشیر نے برمحل یہ شعر پڑھا ہے

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں

ہم چلتے وقت اس خیال سے کسی قدر متردد تھے کہ سوئٹزرلینڈ میں زبان نہ جاننے سے ہمیں دقت ہوگی۔ لیکن ان مالٹی حضرات کے مل جانے سے وہ تردد رفع ہو گیا۔ یہ یورپ کی کئی زبانیں جانتے تھے اور لوسرن کی سیر پہلے بھی کر چکے تھے۔

ہمارے دو ہم سفروں میں ایک نوجوان تھا ایک بوڑھا۔ نوجوان چرٹ اور سگرٹ کی تجارت کرتا تھا اور بوڑھا مالٹا کے ایک مدرسے کا معلم تھا۔ دونوں متوسط حالت کے آدمی تھے مگر محض شوق سیر سے نکلے تھے۔ شمالی افریقہ کی سیر کرتے ہوئے ہسپانیہ پہنچے وہاں سے انگلستان آئے۔ چند روز لنڈن میں رہ کر اب سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کے راستے گھر جا رہے تھے۔ ہم نے ان کی ہمت کی تعریف کی۔ انھوں نے کہا یورپ میں سیر و سیاحت

معمولی زندگی کا ایک ضروری حصہ ہے۔ ہم لوگ سال بھر محنت سے اپنا کام کرتے ہیں۔ مہینہ دو مہینے ہر برس آرام اور تفریح کے لیے بھی چاہیے۔ اس سے آدمی تن درست رہتا ہے اور باقی مہینوں میں کام اچھی طرح کر سکتا ہے۔ آرام کے دنوں میں گھر پڑے رہنے کی نسبت تبدیل آب و ہوا اور طرح طرح کے نظارے دیکھنا زیادہ مفید ہے۔ خصوصاً سیر سے انسان کے خیالات کی وسعت پیدا ہوتی ہے اور گھر گھسنے پن کی جو تنگ خیالی ہوتی ہے رفع ہو جاتی ہے۔ ادھر اُدھر کی چند باتیں کرنے کے بعد وہ آپس میں اپنی زبان میں باتیں کرنے لگے اور ہم اپنی زبان میں۔ ایک دفعہ میں نے جو ذرا کان لگایا تو ان کی گفتگو میں کئی الفاظ عربی معلوم ہوئے۔ میں نے پوچھا "آپ عربی بول رہے ہیں"۔ انھوں نے جواب دیا "نہیں۔ یہ مالٹی ہے، عربی اور اطالین کی ترکیب سے بنی ہے اور اس میں بکثرت عربی الفاظ اب تک موجود ہیں۔ ایک عرصہ تک عربوں کا جزیرہ مالٹا میں عمل دخل رہا ہے اور مالٹی زبان کی ترکیب اس زمانے کا ایک پائدار نقش ہے۔

بولون سے جب گاڑی چلی ہے تو چھ بجے تھے۔ آمین پہنچے تو رات ہو لی تھی اسٹیشن کے قریب آتے ہی دریچے سے سر نکال کر ہم نے بہت چاہا کہ شہر کے نقشے کا کچھ اندازہ ہو سکے مگر سوائے اس کے کہ چراغوں کی روشنی یہ بتائے کہ خاصا بڑا شہر ہے کچھ زیادہ پتہ نہ چلا۔ ہاں تھوڑی دیر اسٹیشن کی سیر کی اور پھر گاڑی میں آ بیٹھے ہم راہیوں نے سونے کی تیاری شروع کی۔

مگر مجھے نیند کیوں کر آتی سوئٹزرلینڈ کو دیکھنے اور ایشیا کے سوئٹزرلینڈ (کشمیر) سے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے میں ہمہ تن انتظار تھا اور کہتا تھا کہ کب صبح ہو گی۔ مشکل یہ کہ رات کو باغ و راغ کا نظارہ بھی ممکن نہ تھا اور نیند بھی نہ ہو سکا۔ "سٹیشن شماری" جاری رہی۔ اگلے وقتوں کے لوگ انتظار میں اختر شماری کیا کرتے تھے، اب وہ ترکیب پرانی ہو گئی۔ ریل کے سفر میں رات کے وقت سٹیشن گننا نئے زمانے کی ایجاد ہے۔ سچ ہے ہر زمانے کی ضرورتیں جدا ہیں اور ایجاد ضرورت کے بطن سے پیدا ہوتی ہے یا جیسا انگریزی والے کہتے ہیں "ضرورت ایجاد کی ماں ہے" چنانچہ ریل کے سفر میں بے تاب طبیعتوں کے واسطے انتظار کی مشکل گھڑیاں آسان کرنے کے لیے "سٹیشن شماری" ایجاد ہوئی۔ اگر کسی نے تجربہ نہ کیا ہو تو میں سفارش کرتا ہوں کہ یہ نسخہ آزمانے کے قابل ہے۔ اختر شماری سے کم دل چسپ نہیں اور طبیعت اس سے تھکتی کم ہے۔ نئی سواریوں کی بے قراری کہ گاڑی میں جگہ ملے، اترنے والوں کی بے تابی کہ جلد اتریں۔ ریل کے اہل کاروں کا ادھر ادھر ٹہلنا جیسے اس چھوٹے سے قطعۂ زمین کے خود مختار بادشاہ ہیں۔ سٹیشن پر روشنی کا نور سٹیشن کے باہر دور اندھیرے میں سرخ و سبز لالٹینوں کی گلنارنگی، اگر کوئی کہے کہ یہ تماشہ دل چسپ نہیں تو اس کا نام صاحبانِ مذاق سلیم کی فہرست سے خارج کر دینا چاہیے میں ہر سٹیشن کو اٹھ کر دیکھتا تھا اور اس کا نام پڑھ کر پنسل سے اپنی یادداشت کی کتاب میں ٹانک لیتا تھا۔ پہلے دو سٹیشن ذرا جلد جلد آئے پھر دیر دیر سے آنے لگے۔ لاوان۔ رحیم پتناکرن

نٹو مان - ورسٹو - بلفورتنگ کی تو رسید دے سکتا ہوں - اس کے بعد چشم انتظار کو بھی خواب نے آلیا - رات آخر رات ہے قدرت کا زبردست نظام اپنے احکام کی تعمیل کرائے بغیر کسے چھوڑتا ہے - صبح کے قریب ذرا سی دیر کے لئے آنکھ لگ گئی اور انتظار کا خاتمہ ہو گیا - آنکھ کھلی تو مول ہاورزن سٹیشن پر گاڑی کھڑی تھی - یہاں سے گویا سوئٹزرلینڈ کا علاقہ اور جرمن زبان کا دور شروع ہوا - اشتہارات جرمن ہیں - مکانوں کے نام جرمن میں - کرخت جرمن بولنے والے لوگ آکر شریک راہ ہونے لگے -

مگر یہاں ان کی کسے فکر تھی - صبح صادق کا سہانا سماں سوئٹزرلینڈ کا خوب صورت ملک، ریل کے دونوں طرف سبزہ ہی سبزہ اور سبزہ پر شبنم کے موتی بہار دے رہے تھے میں کوٹ پہن کر بیٹھ گیا اور علاقہ کی سیر کرنے لگا - اتنے میں سورج نے سر نکالا - درختوں کے پتوں کا ماہ جولائی کا گاڑھا سبز رنگ آغاز بہار کے ہلکے دھانی رنگ کی جھلک دکھانے لگا - مقام بال پر گاڑی رکی تو وہاں کی آبادی کو دیکھ کر جی خوش ہو گیا اور سب سے زیادہ خوشی یہ تھی کہ گھڑی دو گھڑی میں لوسرن پہنچیں گے - صبح کے سات بجے گاڑی ایک عالی شان سٹیشن پر تھی - ایک پرفضا جھیل اس کے کنارے درختوں کی قطار اور درختوں کے پیچھے ہٹ کر اور شاندار عمارتیں یہی لوسرن تھا دیکھتے ہی رات کی کلفت بھول گئی -

لوسرن سٹیشن نہایت عمدہ موقعہ پر واقع ہے - نکلتے ہی سامنے جھیل کا وسیع تختہ آب ہے - دائیں ہاتھ عجائب خانہ کی عمارت اور بائیں

ہاتھ کو بڑے بڑے ہوٹل۔ یہاں کسی نے نہیں پوچھا کہ اسباب میں کیا ہے یہاں کے لوگ مسافروں کو ہر طرح خوش کرنا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ ان کی روزی مسافروں کی کثرت آمد و رفت سے ہے۔ ہم اپنے مالٹی دوستوں کے ساتھ ایک ہوٹل میں گئے جہاں وہ پہلے ٹھہر چکے تھے۔ انہوں نے ہمیں کہا کہ ذرا سستا لیں، دوپہر کو جہاز پر سوار ہو کر جھیل کی سیر کو چلیں گے۔ ہم نے کہا بہت خوب۔ لیکن سستانے کا وقت ہمارے پاس کہاں تھا ہمیں دوسری صبح کے لئے کسی نئے نظارے کی فکر تھی اور لوسرن میں جو کچھ دیکھنا تھا اس کے لئے یہی دن تھا۔ بس ہوٹل میں اسباب رکھتے ہی منہ ہاتھ دھو کر ہم باہر نکلے کہ بارہ بجے تک نزدیک نزدیک کی چیزیں دیکھ آئیں۔

سوئٹزرلینڈ کا ہر حصہ ویسے تو حسن قدرت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے مگر لوسرن اور اس کے قرب و جوار کو یہاں کی سبزی کا خلاصہ کہہ سکتے ہیں۔ حکومت کا صدر مقام اگر برن ہے، تو مناظر قدرت کا مرکز لوسرن ہے۔ کوہ الپس برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کے دیدار اور اس کے شفاف چشموں کی زیارت کے لئے اس سے عمدہ موقع مشکل ہے۔ کوہستان کے ہر قابل دید حصے میں یہاں سے پہنچ سکتے ہیں۔ مناظر قدرت کے شیدائی دنیا کے ہر حصے سے یہاں آتے ہیں اور محبوبۂ بہار کو بے حد رعنائی جلوہ گر پاتے ہیں موسم گرما بسر کرنے کے لئے اس سے زیادہ مزے کی جگہ کیا ہو گی۔ جنہیں دولت اور فراغت دونوں میسر ہیں وہ تو یہاں آ کر مہینوں جانے کا نام نہیں لیتے۔ اس کو مرکز قرار دے کر گرد و نواح کی سیر کر آتے ہیں اور پھر یہیں آ جاتے ہیں۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ ہر سال بہار کے آغاز اور گرما کے اختتام کے درمیان یعنی اپریل کے شروع سے ستمبر کے اخیر تک کوئی تین لاکھ آدمی دوسرے مقامات سے یہاں آتے ہیں۔ ان میں آدھے اگر راہرو فرض کئے جائیں جو آتے جاتے تھوڑی دیر کے لئے اس پُرفضا مقام کی سیر کرتے ہیں تو آدھے ایسے جو یہاں معقول عرصے کے لئے قیام کرتے ہیں۔ ان ہی آنے جانے والوں سے یہاں کے کثیر التعداد ہوٹل اور دیگر مہمان خانے آباد ہیں اور ان ہی کے طفیل سیر و سفر کے لئے ہر طرح کی آسائشیں یہاں مہیا ہیں۔ الپس کی کئی چوٹیوں تک ہلکی ریل جاتی ہے اس کی سڑک کو دور سے دیکھیں تو سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی قلہ کوہ تک چلی گئی ہے۔ گاڑی کو اس ڈھلوان سڑک پر لے جانے کے لئے اس کے انجن اور گاڑیوں کی ساخت میں ایسی کلیں لگائی گئی ہیں جن سے گاڑی قابو میں رہے اور نیچے کو لڑھک نہ جائے۔ جھیل کی سیر کے لئے ہر وقت دخانی جہاز چلتے ہیں جو مختلف قابل سیر موقعوں پر ٹھہرتے ہوئے جاتے ہیں اور ہر جگہ لوگ اتر کر آگے تھوڑی دور پیدل سیر و تماشہ کے لئے چلے جاتے ہیں۔ اس کے سوا گاڑیاں ہیں، گھوڑے ہیں۔ ہاتھ سے چلانے کی کشتیاں ہیں جس مذاق کا کوئی آدمی ہو اپنی پسند کی سواری ڈھونڈھ لے اور سیر کرتا پھرے۔ سبزہ و گل اور کوہ و دریا کے تماشے کے ساتھ شہروں کی زندگی کے مزے ملانا چاہے تو جھیل کے کنارے گھنے سایہ دار درختوں کی دوہری قطار ہے۔ وہاں کرسیاں اور بنچیں رکھی ہیں۔ لوگوں کا جماؤ رہتا ہے۔ بیٹھ جائے اور تماشا دیکھا کرے شام کے قریب باجا بجتا ہے۔ شام کے بعد ناٹک وغیرہ کے تماشے شروع

ہوتے ہیں۔ جھیل کے کنارے روشنی ہی روشنی نظر آتی ہے اور مکانوں کے لیمپ اور سڑک کی لالٹینیں اپنا عکس پانی میں ڈالتی ہیں اور عجیب بہار دیتی ہیں لیکن اگر کوئی شہروں کی ان معمولی دلچسپیوں سے گھبرا کر یہاں آیا ہو اور گوشۂ تنہائی کا متلاشی ہو تو وہ آبادی سے کچھ دور نکل جائے۔ چاروں طرف مناظر قدرت اس کے مونس و ہمدم ہوں گے۔ درختوں کی ٹھنڈی چھانو ہوگی اور برف پوش پہاڑوں کی دل لبھانے والی ہوا۔ وہ ہوگا اور اس کے خیالات، نہ کوئی روکنے والا نہ کوئی ٹوکنے والا، نہ اس تخلیے میں خلل ڈالنے والا اگر کہیں اسی شوق کا مارا اسی کا ہم خیال کوئی اور بھی آنکلا تو وہ اس گوشے کو آباد پاکر خود ہی اور گوشہ ڈھونڈ لے گا۔

ہماری سیر ان دونوں قسموں سے علیحدہ تھی۔ ہمارا اس پر عمل تھا کہ جی بھر کر دیکھنا میسر نہ ہو تو نہ ہونے سے ایک جھلک بھی بہتر ہے۔ جیسے تیتری باغ کی سیر کرتی ہے، ایک پھول سے دوسرے پر۔ ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

اسی طرح ہم تھے کہ ہر چیز کا تھوڑا نمونہ دیکھتے پھرتے تھے۔ ہر نئے مقام کو ابھی پہلا سلام، ابھی آخری سلام۔ جانتے تھے کہ یہی ایک نظر ہے جس کی اجازت ہے۔ پھر کہاں ہم اور کہاں یہ حسن قدرت و صنعت کے جلوے۔

۱۹ر جولائی ۱۹۰۶ء عجائب خانہ صلح و جنگ۔ لوسرن میں پہلی چیز جو ہم نے دیکھی وہ عجائب خانہ تھا۔ بیس مختلف حصوں میں منقسم ہے۔ اس میں آلاتِ حرب اور طریق جنگ میں قدیم زمانوں سے لے کر

آج تک جو تبدیلیاں ہوئی ہیں سلسلہ وار دکھائی گئی ہیں اور اس کی نشا تحریک صلح عام کی تائید ہے۔ داخل ہوتے ہی ایک بڑا ہال ہے جو اسلحہ جنگ سے پُر ہے۔ وسط میں توپیں رکھی ہیں۔ پُرانی سے پرانی توپوں سے لے کر زمانہ حال کی کرپ توپیں تک یہاں موجود ہیں اور ہر ایک کے اوپر لکھا ہوا ہے کہ کون سی کس زمانے کی یادگار ہے۔ دیواروں پر ایک طرف نیزے۔ برچھیاں۔ تلواریں اور دوسری طرف طرح طرح کی بندوقیں سج رہی ہیں۔ ایک کمرہ اسلحۂ روما کے لئے ہے اور ایک ازمنہ متوسطۂ یورپ کے لئے۔ جنگ سی سالہ اور جنگ ہفت سالہ میں جو اسلحہ استعمال ہوئے تھے، ان کا علیحدہ مجموعہ ہے۔ پہاڑی لڑائی کا سین جدا ہے اور جنوبی افریقہ کی جدید لڑائی کا جدا۔ یہ نظارے تاریک کمروں میں بڑی خوبی سے دکھائے گئے ہیں کہ دیکھنے والا اندھیرے میں ہوتا ہے اور سپاہیوں کی تصویروں اور اسلحہ پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کے گرد جنگل پہاڑ اور لڑائی کے سب ان کا نقشہ ہو بہو دکھائی دیتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ لڑائی ہم اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں۔ آخر میں جنگ روس و جاپان بھی موجود ہے۔ قلعہ بندی کے دستور کی ترقی کے مختلف مدارج، بیماروں اور زخمیوں کے اٹھانے اور لے جانے کی تدابیر جنگ میں عارضی پل بنانے اور توڑنے کے نمونے۔ بحری لڑائی کی خصوصیات۔ سب کا ایک خاکہ ذہن میں آجاتا ہے۔ ان سب کے بعد صلح کا محل آتا ہے۔ وہاں یورپ کے سب بڑے بڑے مدبروں کی تصویریں رکھی ہیں۔ جو صلح عام کے حامی ہیں اور جو مجالس صلح میں شریک ہو چکے ہیں۔ ان تصویروں میں

ایک ایرانی مدبر کی تصویر دیکھ کر ہمیں خوشی ہوئی۔ اس تصویر کے نیچے لکھا تھا، ارفع الدولہ مرزا رضا خاں دانش۔ پرنس صلح۔ اہل یورپ نے آج کل ایسی باتوں کا کچھ ایسا ٹھیکہ لے رکھا ہے کہ ہمیں کسی ایشیائی کا مدبروں کی صف اول میں کھڑا ہونا غنیمت معلوم ہوا۔

اس کمرے میں جس پر صلح کا جھنڈا لہرا رہا تھا مختلف زبانوں میں صلح کے متعلق کتابیں اور رسالے اور اخبارات رکھے تھے جن میں سے اکثر مفت تقسیم ہونے کے لئے تھے اور ہر شخص مجاز تھا کہ ان میں سے چند چن لے۔ ہم نے چند پرچے وہاں سے لئے۔ لیکن ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ٹرکی کے ارمنی وغیرہ باشندوں کے بعض نہایت جوش دلانے والے رسالے فرانسیسی زبان میں جن میں ترکوں کو یورپ سے نکالنے اور ان کے خلاف اہل یورپ کو اکسانے کے مضمون مندرج تھے۔ وہ بھی انھیں کاغذات صلح میں رکھے تھے۔ کیا مجلس صلح ایسی ہی تدابیر صلح پھیلانے کی کر رہی ہے اور ان کے قول و فعل میں ایسی ہی مطابقت چاہیے حقیقت یہ ہے کہ صلح عام کی تحریک سے مدبرین یورپ کا مقصود اصلی فقط اسی قدر رہا ہے کہ یورپ کی عیسائی سلطنتوں میں صلح رہے اور وہ سب مل کر باقی دنیا پر اپنا غلبہ اور اقتدار قائم رکھیں لیکن حقیقی صلح ممکن نہیں جب تک دول یورپ اور ان کے مدبروں کے دماغ سے اپنے املاک کی توسیع کی ہوس اور ایشیائی ممالک اور اقوام و مذاہب کی حقارت کا خیال نہ نکل جائے۔ کیوں کہ یہی دو خیال سب فساد کی بنا اور جنگ و جدل کی جڑ ہیں۔ اس صلح و جنگ کے عجائب خانے میں آلات حرب اور نمائش جنگ کو اسباب صلح سے جو نسبت

ہے، غالباً وہی نسبت ابھی یورپ میں شوق جنگ و شوق صلح میں قائم ہے۔ صلح کے متعلق باتیں ہیں اور دوسروں کو نصیحتیں اور اپنے ہاں ہر قوم روز بروز زیادہ سے زیادہ روپیہ سامان جنگ پر صرف کر رہی ہے اور یورپ کی ذہانت اور اس کے علوم و فنون کی ترقی ایسی ایجادات کے کام آ رہی ہے کہ وقت جنگ زیادہ سے زیادہ انسان تھوڑے سے تھوڑے وقت میں کس طرح بے جان کئے جا سکتے ہیں اور زمین سے گولے مارنے کی بجائے آسمان پر چڑھ کر کس طرح آہن و آتش کی بوچھاڑ ہو سکتی ہے۔

برفانی باغ۔ اس عجائب خانۂ صنعت سے نکل کر ہم ایک عجائب خانۂ قدرت کی طرف گئے۔ جسے یہاں "گلیسیر گارڈن" یعنی تودہ ہائے برف کا باغ کہتے ہیں برف کے یہ تودے اس زمانہ کی یادگار ہیں جب سارا سوٹزرلینڈ برف کے نیچے دبا ہوا تھا۔ یہ تاریخی کتب سے بہت پہلے گذرا ہے۔ ماہرانِ علم طبقات الارض نے اس کا پتہ چلایا ہے اور اب وہ یقینی طور پر ثابت کر سکتے ہیں کہ ایک وقت میں روئے زمین کا سارا شمالی حصہ ایک سطح برفانی تھا۔ کہیں اتفاق سے کوئی جگہ خالی تھی تو وہاں بھی حضرت انسان کا وجود نہ تھا۔ البتہ کچھ حیوانات تھے۔ مگر اب ان حیوانات کی نسل بھی مقطوع ہے۔ کہیں کہیں ان کے پنجے اور ہڈیاں دستیاب ہوئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ساخت کیا تھی اور موجودہ جانوروں سے کس قدر نرالی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس برفانی عہد سے قبل ایک زمانہ ایسا تھا کہ ساری زمین پر پانی ہی پانی تھا۔ مگر اس وقت اس زمانہ سے بحث نہیں بلکہ صرف عہد برف سے کام ہے جس کی یہ حیرت انگیز

نشانی وسرن میں موجود ہے۔ برف کے پگھلنے سے جو سیلاب پہاڑوں کے اندر رواں ہوا اس میں کئی بڑے بڑے تودے برف کے جو پگھلنے سے بچ رہے بہتے ہوئے آئے اور اپنے زور میں پتھروں کو تراشتے ہوئے آخر خود ایک چکر میں آپھنسے۔ یعنی ایسی جگہ پہنچے جہاں وہ چاروں طرف مضبوط چٹانوں سے گھر گئے۔ اب نہ "روئے ماندن نہ راہ رفتن" جائیں تو کہاں جائیں۔ پانی ہے کہ اوپر سے برابر آرہا ہے اور انھیں حرکت دیئے جاتا ہے۔ مگر یہ قلعہ بند ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر آرام سے بیٹھے تھے۔ اپنی جگہ چھوڑ کر اس مصیبت میں آن پھنسے کہ رات دن ایک مقام پر چکی کی طرح گھوم رہے ہیں۔ خود بھی گھستے ہیں پتھروں کو بھی گھساتے ہیں۔

یہ خدمت صدیوں سے ان کے سپرد ہے، نہ کبھی رخصت نہ تعطیل۔ اتنی خیریت تھی کہ چشم مردم سے ان کی یہ سزا پوشیدہ تھی۔ مگر آج کل انسان کو یہ جرأت ہوئی ہے کہ ہر جگہ کارخانۂ قدرت سے پردہ راز اٹھانا چاہتا ہے۔ چنانچہ بے چارے معتوب تودہ ہائے برف کی پردہ دری کیے بغیر بھی نہ رہا۔ سنہ ۱۸۷۲ء تک یہ قطعہ زمین جہاں اب یہ عجیب برفانی باغ ہے ایک چراگاہ تھا اور اس کی ہری ہری گھاس کے نیچے یہ برفانی کارخانہ جاری تھا۔ مگر کسی کو اس کی خبر نہ تھی۔ اتفاق سے ایک جگہ زمین میں سوراخ ہو گیا اور وہاں سے اس برفانی چکی کی آواز آئی۔ کھودنے پر یہ عجوبہ نظر آیا۔ اور پھر ایک چکی کے دریافت ہونے سے اسی قرب میں کئی اور چکیاں نکل آئیں اور اس حصہ کو تماشائیوں کو محو حیرت کرنے کے لیے آراستہ کر دیا گیا۔ اس کھدائی

میں اس عہد کے جانور اور درخت ملے جو پتھر کی طرح سخت بن چکے تھے۔ اب لوگ جوق جوق ان عجائبات کو دیکھنے آتے ہیں۔ تواریخ و جغرافیہ دونوں علوم کے شائقوں کی دلچسپی کا سامان یہاں موجود ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے قدیم باشندوں کی جھونپڑیوں ان کے ہتھیاروں اور اوزاروں کے نمونے بھی اسی احاطے میں ایک جگہ دکھائے گئے ہیں۔ اور عام تماشائیوں کی دلچسپی کے لیئے ایک نہایت خوش وضع بھول بھلیاں بنائی گئی ہے جو عربوں کے مشہور قصر الحمرا کی بھول بھلیاں کی نقل ہے۔ بھول بھلیاں سے نکلتے ہی باغ کا وہ حصہ سامنے آتا ہے جہاں چٹان کاٹ کر ایک بڑا شیر بنایا گیا ہے۔ جس پر شہر لوسرن کو ناز ہے اور جو فی الواقع سنگ تراشی کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔

باغ سے لوٹتے ہوئے ہوف کرک جو کیتھولک مذہب کا بڑا گرجا ہے رستے میں پڑتا تھا۔ ہم نے اسے بھی ایک نظر دیکھا۔ بلندی پر واقع ہے اور بہت سی سیڑھیاں چڑھ کر اس کے دروازہ تک پہنچتے ہیں۔ عام طور پر عیسائی گرجاؤں میں ایک مخروطی مینار ہوتا ہے۔ اس گرجا کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے دو مخروطی مینار بنائے گئے ہیں جنھیں جڑواں مینار کہتے ہیں۔ گرجا کے اندر لکڑی کا کام بہت خوب صورت بنا ہے۔ پندرھویں صدی عیسوی کی ساخت کا نمونہ ہے۔ اس زمانہ میں اہلِ سوئٹزرلینڈ کو لکڑی کے کام کا بہت شوق تھا گو اب بھی وہ اس فن میں کسی سے پیچھے نہیں۔ اس گرجا کی شہرت صرف اس کی بڑائی اور وسعت

کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس کے ارغنوں کی وجہ سے ہے۔ یورپ کے گرجاؤں کے ارغنوں بجائے خود عجائبات ہیں۔ دھات کی لمبی لمبی بانسری نما نلیاں متوازی رکھ کر ایسی بلند اور سریلی آواز پیدا کی جاتی ہے کہ گرجا گونج اٹھتا ہے۔ فن موسیقی کے ماہر ایک ایک ارغنوں کی ساخت میں اپنا کمال صرف کر دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ ارغنوں جو ہوف کرف کی زینت ہے گانسلر نامی ایک استاد نے ۱۶۵۰ء میں بنایا تھا۔ اس کے بعد ہاس نامی ایک اور استاد نے ۱۸۶۲ء میں اس کی تجدید کی۔ ۱۸۹۸ء میں پھر اس کی مرمت ہوئی ہے۔ چار ہزار نو سو پچاس بنسریاں اس ارغنوں میں ہیں۔ لوگ دور دور سے اس کا راگ سننے آتے ہیں۔ شام کے وقت ہر روز یہ ارغنوں بجتا ہے اور اس وقت کا داخلہ ایک فرانک (دس آنے) ہوتا ہے۔

جھیل کی سیر۔ جھیل لوسرن جس سے شہر لوسرن نے نام پایا ہے۔ اس ملک کی نہایت خوب صورت جھیلوں میں سے ہے اور بعض اعتبارات سے سب سے بڑھ کر گنی جاتی ہے۔ اس کا طول ۲۲ میل ہے اور عرض آدھے میل سے لے کر تین میل تک ہے۔ چاروں طرف بلند پہاڑوں کی سرسبز چوٹیاں اور درمیان میں یہ جھیل عجیب بہار دیتی ہے جس سیاح کو فرصت ہو وہ یہاں مہینوں رہے اور روز کشتی میں بیٹھ کر سیر کو جائے۔ جہاں کہیں خشکی پر اتر کر کوہستان کی سیر کرے گا، اس کے لئے کوئی نہ کوئی قابلِ دید منظر موجود ہو گا۔ ہمیں صرف ایک دن کی مہلت دی گئی تھی۔

اس لیے ہم گرجا سے واپس آتے ہی کشتی پر بیٹھ کر جھیل کی سیر کو نکلے۔ مطلع صاف تھا۔ ہوا خوش گوار تھی۔ گرد و پیش کے مناظر مزا دے رہے تھے۔ ابھی لطف سے سیری نہیں ہوئی تھی کہ وہ سٹیشن آگیا جہاں سے ملکی پہاڑی ریل پر بیٹھ کر کوہ الپس کی مشہور چوٹی "رگی کلم" کی سیر کو جاتے ہیں۔ ہم وہیں اتر پڑے اور ریل پر سوار ہو لیے۔

رگی کلم کا منظر۔ ریل سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی پہاڑ پر چڑھنے لگی۔ ایسی ایسی ڈھلواں چوٹیوں پر چڑھتی ہے کہ اب گری اب گری۔ مگر فن انجینیری کی خوبی دیکھیے، گاڑیوں اور آہنی سڑک، دونوں کی ساخت میں وہاں یہ خصوصیت پیدا کی ہے کہ گاڑیاں لڑھکنے نہ پائیں اور مزید احتیاط کے لیے اوپر جاتے وقت انجن نیچے سے اوپر کو ڈھکیلے لیے جاتا ہے اور رگی پر جا کر ٹھیرتا ہے جو اس سطح سے جہاں سے ریل ملی تھی چار ہزار تین سو ساٹھ فٹ اور سطح سمندر سے پانچ ہزار نو سو پانچ فٹ بلند ہے صبح و شام سینکڑوں تماشائی اس چوٹی پر موجود رہتے ہیں اور جو تماشا وہاں انھیں نظر آتا ہے، الفاظ اس کے بیان سے قاصر ہیں۔ تصور کیجیے کہ چودہ جھیلیں چھوٹی بڑی اور ان کے گرد کے اشجار و انہار کوہ و ہامون۔ شہر و قریہ وہاں سے نظر آتے ہیں۔ اور یہ سین اہل نظر کے دل چھینے لیتا ہے اس طرہ یہ کہ اس سے ذرا اونچی چوٹیاں اسی کے قریب برف سے ڈھکی ہوئی نظر آتی ہیں۔ انگلستان اور امریکہ کی عورتیں جو مناظر قدرت کی شناسا آنکھ رکھتی ہیں اس جنت نگاہ کی داد دیتے دیتے دیوانہ ہوئی جاتی ہیں۔

"آہاہا۔ ادھر دیکھنا کیسا دل فریب سین ہے۔ اہو ہو۔ ادھر دیکھو

کتنا پیارا نظارہ ہے" ایشیائیوں میں اگر کوئی حسن قدرت کے مزا لینے کی قابلیت رکھتا ہو یا پیدا بھی کرلے تو یہ جوش کہاں سے لائیگا اور حسن قدرت کے روبرو یہ زبان آوری کہاں سے پائے گا۔ یاں تو حسن چپ لگا دیتا ہے اور اس کا رعب مہر لب بن جاتا ہے۔ ہم چپ چاپ اس عجیب نظارے کو دیکھا کئے اور ارد گرد کے شور سے بے پروا۔ شام تک اسی محویت میں پڑے رہتے اگر ریل کی سیٹی یہ یاد نہ دلا دیتی کہ شام سے پہلے واپس جاکر جھیل کے کنارے چراغاں کی سیر بھی دیکھنے کے لائق ہے۔ اٹھے مگر بادل ناخواستہ۔ اسی چوٹی پر ایک بڑا عالی شان ہوٹل مسافروں اور تماشائیوں کے آرام اور تفریح کے لئے بنا ہوا ہے۔ وہ سامنے تھا اس کی صورت اور اس کے خوش نما صحن میں میزوں کے ارد گرد لوگوں کے جمگھٹے دیکھ کر ہمیں بھی یاد آیا کہ چائے کا وقت ہے۔ وہاں چا پی۔ تازہ دم ہوئے اور ریل پر پہنچے۔ واپسی پر ریل تیز تر چلی۔ کوئی آدھ گھنٹے میں جھیل کے کنارے تھے۔ وہاں کشتی فوراً مل گئی اور ہم اپنی قیام گاہ کے قریب آپہنچے۔ تھوڑی دیر تک کنار آب سیر کرتے رہے۔ آخر تھک کر ہوٹل میں آئے۔ کھانا کھایا اور سو گئے کیوں کہ سفر اٹلی درپیش تھا۔

حکایت بادۂ و تریاک

قلعہ احمد نگر
۲۷ اگست سنہ ۴۲ء

صدیق مکرم - انسان اپنی ایک زندگی کے اندر کتنی ہی مختلف زندگیاں بسر کرتا ہے۔ مجھے بھی اپنی زندگی کی دو قسمیں کر دینی پڑیں۔ ایک قید خانے سے باہر کی، اور اندر کی۔ دونوں زندگیوں کے مرقع کی الگ الگ رنگ و روغن سے نقش آرائی ہوئی ہے۔ آپ شاید ایک کو دیکھ کر دوسری کو نہ پہچان سکیں۔ قید سے باہر کی زندگی میں اپنی طبیعت کی افتاد بدل نہیں سکتا۔ خود رفتگی اور خود مشغولی مزاج پر چھائی رہتی ہے۔ دماغ اپنی فکروں سے باہر نہیں آنا چاہتا اور اپنی نقش آرائیوں کا گوشہ چھوڑنا نہیں چاہتا۔ بزم و انجمن کے لئے بار خاطر نہیں ہوتا لیکن یار شاطر بھی بہت کم بن سکتا ہوں۔

لیکن جوں ہی حالات کی رفتار قید و بند کا پیام لاتی ہے میں کوشش کرنے لگتا ہوں کہ اپنے آپ کو یک قلم بدل دوں۔ میں اپنا پچھلا دماغ سر سے نکال دیتا ہوں اور نئے دماغ سے اس کی خالی جگہ بھرنی چاہتا ہوں۔ حریم دل کے طاقوں کو دیکھتا ہوں کہ خالی ہو گئے تو کوشش کرتا ہوں کہ نئے نئے نقش و نگار بناؤں اور انھیں پھر سے آراستہ کر دوں۔ ع

"وقتیست دگر بت کدہ سازند حرم را"

اگر آپ مجھے اس عالم میں دیکھیں تو خیال کریں میری پچھلی زندگی مجھے قید خانے کے دروازے تک پہنچا کر واپس چلی گئی۔ اور اب ایک دوسری ہی زندگی سے سابقہ پڑا ہے۔ جو زندگی کل تک اپنی حالتوں میں گم اور خوش کامیوں اور دل شگفتیوں سے بہت کم آشنا تھی آج اچانک ایک ایسی زندگی کے قالب میں ڈھل گئی جو شگفتہ مزاجیوں اور خندہ روئیوں کے سوا اور کسی بات سے آشنا ہی نہیں "ہر وقت خوش رہو اور ہر ناگوار حالت کو خوش گوار بناؤ" جس کا دستور العمل ہے۔

میں نے قید خانہ کی زندگی کو دو متضاد فلسفوں سے ترکیب دی ہے۔ اس میں ایک جزو رواقیہ (STOICS) کا ہے، ایک لذتیہ (Epicureans) کا۔ جہاں تک حالات کی ناگواریوں کا تعلق ہے، رواقیت سے ان کے زخموں پر مرہم لگاتا ہوں اور ان کی چبھن بھول جانے کی کوشش کرتا ہوں۔ جہاں تک زندگی کی خوش گواریوں کا تعلق ہے، لذتیہ کا زاویۂ نگاہ کام میں لاتا ہوں اور خوش رہتا ہوں۔ میں نے اپنے کاک ٹیل (COCKTAIL) کے جام میں دونوں بوتلیں اونڈیل دیں۔ میرا ذوق بادہ آشامی بغیر اس جام مرکب کے تسکین نہیں پا سکتا تھا۔ اسے قدیم تعبیر میں یوں سمجھئے کہ گویا حکایت بادۂ و تریاک میں نے تازہ کر دی ہے۔ البتہ کاک تیل کا یہ نسخہ، خاص ہر خام کار کے بس کی چیز نہیں ہے۔ صرف بادہ گساران کہن مشق ہی اسے کام میں لا سکتے ہیں۔ ورموتھ (VERMUTH) اور جن (GIN) کا مرکب پینے والے اس رطل گراں

کے متحمل نہیں ہو سکیں گے۔

آپ کہیں گے قید خانہ کی زندگی رواقیت کے لئے تو موزوں ہوئی کہ زندگی کے رنج و راحت سے بے پروا بنا دینا چاہتی ہے، لیکن لذتیہ کے عشرت اندوزیوں کا وہاں کیا موقعہ ہوا؟ جو نامراد قید خانے سے باہر کی آزادیوں میں بھی زندگی کی عیش کوشیوں سے تہی دست رہتے ہیں انھیں قید و بند کی محروم زندگی میں اس کا سر و سامان کہاں میسر آسکتا ہے۔ لیکن میں آپ کو یاد دلاؤں گا کہ انسان کا اصلی عیش، دماغ کا عیش ہے جسم کا نہیں ہے۔ میں لذتیہ سے ان کا دماغ لیتا ہوں جسم ان کے لئے چھوڑ دیتا ہوں۔ داغ مرحوم نے ناصح سے صرف اس کی زبان لے لینی چاہی تھی ؎

ملے جو حسرتِ بیجا، لے لوں زبان ناصح کی
عجیب چیز ہے یہ طول مدعا کے لئے

اور غور کیجئے تو یہ بھی ہمارے وہم و خیال کا ایک فریب ہی ہے کہ سر و سامانِ کار ہمیشہ اپنے سے باہر ڈھونڈھتے رہتے ہیں۔ اگر یہ پردۂ فریب ہٹا کر دیکھیں تو صاف نظر آجائے کہ وہ ہم سے باہر نہیں ہے۔ خود ہمارے اندر ہی موجود ہے عیش و مسرت کی جن گل شگفتگیوں کو ہم چاروں طرف ڈھونڈھتے ہیں اور نہیں پاتے وہ ہمارے نہاں خانۂ دل کے چمن زاروں میں ہمیشہ کھلتے اور مرجھاتے رہتے ہیں۔ لیکن محرومی ساری یہ ہوئی کہ ہمیں چاروں طرف کی خبر ہے مگر خود اپنی خبر نہیں ؎

کہیں تجھ کو نہ پایا گرچہ ہم نے اک جہاں ڈھونڈھا
پھر آخر دل ہی میں پایا، بغل ہی میں سے تو نکلا!

جنگل کے مور کو کبھی باغ و چمن کی جستجو نہیں ہوئی۔ اس کا چمن خود اس کی بغل میں موجود رہتا ہے۔ جہاں کہیں اپنے پروں کو کھول دے گا، ایک چمنستان بوقلموں کھل جائے گا۔

(قید خانے کی چار دیواری کے اندر بھی سورج ہر روز چمکتا ہے اور چاندنی راتوں نے کبھی قیدی اور غیر قیدی میں امتیاز نہیں کیا۔ اندھیری راتوں میں جب آسمان کی قندیلیں روشن ہو جاتی ہیں تو وہ صرف قید خانے کے باہر ہی نہیں چمکتیں، اسیرانِ قید و محن کو بھی اپنی جلوہ فروشیوں کا پیام بھیجتی رہتی ہیں۔ صبح جب طباشیر بکھیرتی ہوئی آئے گی اور شام جب شفق کی گل گوں چادریں پھیلانے لگے گی، تو صرف عشرت سراؤں کے دریچوں ہی سے ان کا نظارہ نہیں کیا جائے گا، قید خانے کے روزنوں سے لگی ہوئی نگاہیں بھی انھیں دیکھ لیا کریں گی۔ فطرت نے انسان کی طرح کبھی یہ نہیں کیا کہ کسی کو شاد کام رکھے، کسی کو محروم کر دے۔ جب وہ کبھی اپنے چہرے سے نقاب الٹتی ہے تو سب کو یکساں طور پر نظارۂ حسن کی دعوت دیتی ہے۔ یہ ہماری غفلت اندیشی ہے کہ نظر اٹھا کر دیکھتے نہیں اور صرف اپنے گرد و پیش ہی میں کھوئے رہتے ہیں۔) ے

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں، ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا

جس قید خانے میں صبح ہر روز مسکراتی ہو، جہاں شام ہر روز پردۂ شب میں چھپ جاتی ہو، جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے

لگتی ہوں کبھی چاندنی کی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہوں، جہاں دوپہر ہر روز چمکے، شفق ہر روز نکھرے، پرندے ہر صبح و شام چہکیں، اسے قید خانہ ہونے پر بھی عیش و مسرت کے سامانوں سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے؟ یہاں سروسامان کار کی تو اتنی فراوانی ہوئی کہ کسی گوشے میں بھی گم نہیں ہو سکتا۔ مصیبت ساری یہ ہے کہ خود ہمارا دل و دماغ ہی گم ہو جاتا ہے۔ ہم اپنے سے باہر ساری چیزیں ڈھونڈھتے رہیں گے مگر اپنے کھوئے ہوئے دل کو کبھی نہیں ڈھونڈھیں گے۔ حالانکہ اگر اسے ڈھونڈ نکالیں تو عیش و مسرت کا سارا سامان اسی کوٹھری کے اندر سمٹا ہوا مل جائے۔

ایوان و محل نہ ہوں تو کسی درخت کے سائے سے کام لیں۔ دیبا و مخمل کا فرش نہ ملے تو سبزۂ خودرو کے فرش پر جا بیٹھیں۔ اگر برقی روشنی کے کنول میسر نہیں ہیں تو آسمان کی قندیلوں کو کون بجھا سکتا ہے؟ اگر دنیا کی ساری مصنوعی خوش نمائیاں اوجھل ہو گئی ہیں تو ہو جائیں، صبح اب بھی ہر روز مسکرائے گی چاندنی اب بھی جلوہ فروشیاں کرے گی۔ لیکن اگر دل زندہ پہلو میں نہ رہے تو خدارا بتلائیے اس کا بدل کہاں ڈھونڈھیں؟ اس کی خالی جگہ بھرنے کے لئے کس چولھے کے انگارے کام دیں گے؟

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ! تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے!

میں آپ کو بتلاؤں، اس راہ میں میری کامرانیوں کا راز کیا ہے؟ میں اپنے دل کو مرنے نہیں دیتا۔ کوئی حالت ہو، کوئی جگہ ہو، اس کی تڑپ کبھی دھیمی نہیں پڑے

گی۔ میں جانتا ہوں کہ جہاں زندگی کی ساری رونقیں اسی مے کدۂ خلوت کے دم سے ہیں، یہ اجڑا اور ساری دنیا اجڑ گئی۔

باہر کے ساز و سامانِ عشرت مجھ سے چھن جائیں، لیکن جب تک یہ نہیں چھنتا، میرے عیش کی سرمستیاں کون چھین سکتا ہے؟

آپ کو معلوم ہے میں ہمیشہ صبح تین سے چار بجے کے اندر اٹھتا ہوں اور چائے کے پیہم فنجانوں سے جامِ صبوحی کا کام لیا کرتا ہوں۔

(یہ وقت ہمیشہ میرے اوقاتِ زندگی کا سب سے زیادہ پُرکیف وقت ہوتا ہے لیکن قید خانے کی زندگی میں تو اس کی سرمستیاں اور خود فراموشیاں ایک دوسرا ہی عالم پیدا کر دیتی ہیں۔ یہاں کوئی آدمی ایسا نہیں ہوتا جو اس وقت خواب آلود آنکھیں لئے ہوئے اٹھے اور قرینہ سے چائے بنا کر میرے سامنے دھر دے اس لئے خود اپنے ہی دستِ شوق کی سرگرمیوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ میں اس وقت بادۂ کہن کے شیشہ کی چینی چائے کا تازہ ڈبہ کھولتا ہوں اور ایک ماہرِ فن کی دقیقہ سنجیوں کے ساتھ چائے دم دیتا ہوں، پھر جام و صراحی کو میز پر داہنی طرف جگہ دوں گا کہ اس کی اولیت اس کی مستحق ہوئی۔ قلم و کاغذ کو بائیں طرف رکھوں گا کہ سر و سامانِ کار میں ان کی جگہ دوسری ہوئی۔ پھر کرسی پر بیٹھ جاؤں گا اور کچھ نہ پوچھیے کہ بیٹھتے ہی کس عالم میں پہنچ جاؤں گا؟)

آپ کو معلوم ہے کہ میں چائے پینے کے لئے روسی فنجان کام میں لاتا ہوں۔ یہ چائے کی معمولی پیالیوں سے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ اگر

بے ذوق کے ساتھ پیجیے تو دو گھونٹ میں ختم ہو جائیں۔ مگر خدانخواستہ میں ایسی بے ذوقی کا مرتکب کیوں ہونے لگا؟ میں جرعہ کشاں کہن مشق کی طرح ٹھہر ٹھہر کر پیوں گا اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ لوں گا۔ پھر جب پہلا فنجان ختم ہو جائے گا تو کچھ دیر کے لئے رک جاؤں گا اور اس درمیانی وقفہ کو امتداد کیف کے لئے جتنا طول دے سکتا ہوں، طول دوں گا۔ پھر دوسرے اور تیسرے کے لئے ہاتھ بڑھاؤں گا اور دنیا کو اور اس کے سارے کارخانۂ سود و زیاں کو یک قلم فراموش کر دوں گا۔

اس وقت بھی کہ یہ سطریں بے اختیار نوک قلم سے نکل رہی ہیں، اسی عالم میں ہوں اور نہیں جانتا کہ ۹ راگست کی صبح کے بعد سے دنیا کا کیا حال ہوا اور اب کیا ہو رہا ہے۔

میرا دوسرا وقت کیف وقت دوپہر کا ہوتا ہے یا زیادہ صحت تعین کے ساتھ کہوں کہ زوال کا ہوتا ہے۔ لکھتے لکھتے تھک جاتا ہوں تو تھوڑی دیر کے لئے لیٹ جاتا ہوں، پھر اٹھتا ہوں، غسل کرتا ہوں، چائے کا دور تازہ کرتا ہوں اور تازہ دم ہو کر پھر اپنی مشغولیتوں میں گم ہو جاتا ہوں۔ اس وقت آسمان کی بے داغ نیل گونی اور سورج کی بے نقاب درخشندگی کا جی بھر کے نظارہ کروں گا اور رواق دل کا ایک ایک دریچہ کھول دوں گا۔ گوشہ ہائے خاطر افسردگیوں اور گرفتگیوں سے کتنے ہی غبار آلود ہوں لیکن آسمان کی کشادہ پیشانی اور سورج کی چمکتی ہوئی خندہ روئی دیکھ کر ممکن نہیں کہ اچانک روشن نہ ہو جائیں۔

لوگ ہمیشہ اس کھوج میں لگے رہتے ہیں کہ زندگی کو بڑے بڑے کاموں کے لئے کام میں لائیں، لیکن نہیں جانتے کہ یہاں ایک سب سے بڑا کام خود زندگی ہے یعنی زندگی کو ہنسی خوشی کاٹ دینا۔ یہاں اس سے زیادہ سہل کام کوئی نہ ہوا کہ مر جائیے اور اس سے زیادہ مشکل کام کوئی نہ ہوا کہ زندہ رہیے۔ جس نے یہ مشکل حل کرلی، اس نے زندگی کا سب سے بڑا کام انجام دے دیا۔

غالباً قدیم چینیوں نے زندگی کے مسئلہ کو دوسری قوموں سے بہتر سمجھا تھا۔ ایک پرانے چینی مقولہ میں سوال کیا گیا ہے "سب سے زیادہ دانش مند آدمی کون ہے"؟ پھر جواب دیا ہے "جو سب سے زیادہ خوش رہتا ہے"۔ اس سے ہم چینی فلسفۂ زندگی کا زاویۂ نگاہ معلوم کر سکتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ یہ بالکل سچ ہے۔

اگر آپ نے یہاں ہر حال میں خوش رہنے کا ہنر سیکھ لیا ہے تو یقین کیجئے کہ زندگی کا سب سے بڑا کام سیکھ لیا ہے۔ اب اس کے بعد اس سوال کی گنجائش ہی نہیں رہی کہ آپ نے اور کیا کیا سیکھا؟ خود بھی خوش رہیے اور دوسروں سے بھی کہتے رہیے کہ اپنے چہرے کو غمگین نہ بنائیں۔

زمانۂ حال کے ایک فرانسیسی اہل قلم آندری ژید (Andre Guide) کی ایک بات مجھے بہت پسند آئی جو اس نے اپنی خود نوشتہ سوانح عمری میں لکھی ہے۔ خوش رہنا محض ایک طبعی احتیاج ہی نہیں ہے بلکہ ایک اخلاقی ذمہ داری ہے۔ یعنی ہماری انفرادی زندگی کی نوعیت کا اثر صرف ہم ہی تک محدود نہیں

رہنا وہ دوسروں تک بھی متعدی ہوتا ہے۔ یا یوں کہیئے کہ ہماری ہر حالت کی چھوت دوسروں کو بھی لگتی ہے۔ اس لئے ہمارا اخلاقی فرض ہوا کہ خود افسردہ خاطر ہو کر دوسروں کو افسردہ خاطر نہ بنائیں۔

"افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را!"

ہماری زندگی ایک آئینہ خانہ ہے۔ یہاں ہر چہرے کا عکس بہ یک وقت متعدد آئینوں میں پڑنے لگتا ہے۔ اگر ایک چہرے پر بھی غبار آ جائے گا تو سیکڑوں چہرے غبار آلود ہو جائیں گے۔ ہم میں سے ہر فرد کی زندگی محض ایک انفرادی واقعہ نہیں ہے وہ پورے مجموعہ کا حادثہ ہے۔ دریا کی سطح پر ایک ایک لہر تنہا اٹھتی ہے لیکن اسی ایک لہر سے بے شمار لہریں بنتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں ہماری کوئی بات بھی صرف ہماری نہیں ہوئی۔ ہم جو کچھ اپنے لئے کرتے ہیں، اس میں دوسروں کا حصہ ہوتا ہے۔ ہماری کوئی خوشی بھی ہمیں خوش نہیں کر سکے گی، اگر ہمارے چاروں طرف غمناک چہرے اکٹھے ہو جائیں گے۔ ہم خود خوش رہ کر دوسروں کو خوش کرتے ہیں اور دوسروں کو خوش دیکھ کر خود خوش ہونے لگتے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ مذہب، فلسفہ، اور اخلاق تینوں نے زندگی کا مسئلہ حل کرنا چاہا اور تینوں میں خود زندگی کے خلاف رجحان پیدا ہو گیا۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ایک آدمی جتنا زیادہ بجھا دل اور سوکھا چہرہ لے کر پھرے گا اتنا ہی زیادہ مذہبی، فلسفی اور اخلاقی قسم کا ہوگا۔ گویا علم اور تقدس دونوں کے لئے یہاں ماتمی زندگی ضروری ہوئی۔

آپ جانتے ہیں کہ اہل ذوق کی مجلس طرب تنگ دلوں کے گوشۂ خاطر

کی طرح تنگ نہیں ہوتی۔ اس کی وسعت میں بڑی سمائی ہے۔ لیکن اتنی سمائی ہونے پر بھی اگر کسی چیز کی وہاں گنجائش نہ نکل سکی تو وہ زاہدانِ خشک کے ضخیم اور گنبد نما عمامے تھے۔ ایک عمامہ بھی پہنچ جاتا ہے تو پوری مجلس تنگ ہو جاتی ہے۔ اسی لئے بعض یاران بے تکلف کو کہنا پڑا تھا! ؎

در مجلس یا زاہد! زنہار تکلف نیست

البتہ تو می گنجی، عمامہ نمی گنجد!

یہ سچ ہے کہ جن مسئلوں کو دنیا سیکڑوں برس کی کاوشوں سے بھی حل نہ کر سکی، آج ہم اپنی خوش طبعی کے چند لطیفوں سے انھیں حل نہیں کر سکتے۔ تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ ایک حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک فلسفی، ایک زاہد، ایک سادھو کا خشک چہرے بنا کر ہم اس مرقع میں کھپ نہیں سکتے جو نقاش فطرت کے موقلم نے یہاں کھینچ دیا ہے۔ جس مرقع میں سورج کی چمکتی ہوئی پیشانی، چاند کا ہنستا ہوا چہرہ، ستاروں کی چشمک درختوں کا رقص، پرندوں کا نغمہ، آب رواں کا ترنم، اور پھولوں کی رنگین ادائیں اپنی اپنی جلوہ طرازیاں رکھتی ہوں۔ اس میں ہم ایک بجھے ہوئے دل اور سوکھے ہوئے چہرے کے ساتھ جگہ پانے کے یقیناً مستحق نہیں ہو سکتے۔ فطرت کی اس بزمِ نشاط میں تو وہی زندگی سج سکتی ہے جو ایک دہکتا ہوا دل پہلو میں اور چمکتی ہوئی پیشانی چہرے پر رکھتی ہو اور چاندنی میں چاند کی طرح نکھر کر ستاروں کی چھاؤں میں ستاروں کی طرح چمک کر پھولوں کی صف میں پھولوں کی طرح کھل کر اپنی جگہ نکال لے سکتی ہو۔

اُردو کے چند اہم نثر نگار

۱۔ غالبؔ

مرزا اسد اللہ خاں غالب ۱۷۹۶ء میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے غالب فطرۃً شاعر تھے۔ بہت جلد شہرہ ہو گیا۔ لیکن ابتدائی شہرت ہمت افزا نہ تھی۔ کلام بہت مشکل اور دقیق تھا۔ اس لئے عام طور پر پسند نہ کیا گیا۔ دوستوں کے کہنے سے جب کلام کو آسان بنانے کی کوشش کی۔ اس وقت حقیقی شہرت نصیب ہوئی ۱۸۵۴ء میں ذوق کی وفات کے بہادر شاہ ظفر کے استاد ہو گئے۔ نواب واجد علی شاہ کے دربار سے بھی وظیفہ تھا۔ سرکار برطانیہ سے بھی ساڑھے سات سو روپے سالانہ پنشن تھی۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے ان کی آمدنی کے ذرائع بند کر دیئے۔ اور غالب پریشان حال رہنے لگے۔ بڑی مشکل سے سرکار برطانیہ نے ان کی پنشن پھر سے جاری کی۔ گذر اوقات ہونے لگی ۱۸۶۹ء میں دہلی میں انتقال کیا۔ درگاہ نظام الدین اولیاء میں مدفون ہیں۔

غالب بڑے با اخلاق تھے۔ ہندو مسلمان سب ہی ان کے دوست اور شاگرد تھے۔ شگفتہ مزاجی کی وجہ سے ان کا حلقہ احباب وسیع تھا صرف

دہلی ہی نہیں۔ بلکہ سارے ہندوستان میں ان کے دوست موجود تھے وہ ہر شخص سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ جو خطوط انہوں نے دوستوں کو لکھے ہیں ان کے ایک ایک لفظ سے محبت ٹپکتی ہے۔ طبیعت میں شوخی و ظرافت تھی۔ شاعری و نثر دونوں میں یہ حسن عام ہے۔

اردو نثر میں غالب کا لازوال سرمایہ ان کے ادبی خطوط ہیں، جو انہوں نے وقتاً فوقتاً اپنے دوستوں اور شاگردوں کو لکھے تھے۔ یہ خطوط بعد میں عود ہندی اور ادبی خطوط غالب کے نام سے شائع ہوئے اور بہت مقبول ہوئے۔ ان خطوط نے اردو میں ایک نئے اسلوب نگارش کی ابتدا کی جس میں شوخی رنگینی اور واقعیت کے ساتھ حسن اور سادگی بھی ہے۔ غالب نے ان خطوط میں فارسی کے لمبے القاب و آداب کا استعمال ترک کر دیا ہے۔ یہ خطوط سادہ اور مختصر القاب و آداب سے شروع ہوتے ہیں۔ بعض خطوط بغیر کسی آداب و القاب کے بھی لکھے گئے ہیں۔ غالب نے اس طرز کو آخر تک نبایا ہے۔ ان کے خطوط مقفی اور مسجع عبارتوں سے بری ہیں۔ لفاظی اور عبارت آرائی کی جگہ سیدھی سادی صاف اور سلیس عبارتیں ہیں۔ جو دلوں کو متاثر کرتی ہیں۔ بسا اوقات یہ خطوط مکالمے کے انداز پر ہوتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاتب اور مکتوب الیہ آمنے سامنے بیٹھے ہیں۔ اس طرح مراسلہ بالکل مکالمہ ہو گیا ہے۔ جیسا کہ خود فرماتے ہیں۔

" مرزا صاحب میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ

بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔"

ان خطوط کی ادبی اہمیت کے علاوہ تاریخی اہمیت بھی ہے۔ کیونکہ ان میں انیسویں صدی کے وسط کے واقعات و حوادث کے مرقعے موجود ہیں۔ ان خطوط کے مطالعہ کے بعد اس دور کی تہذیب، اور معاشرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ غالب کے اخلاق و عادات اور طرزِ زندگی کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔ مختصر یہ کہ ان میں بہت سی مفید معلومات، تنقیدی اور ادبی نکات مندرج ہیں۔ ان ہی وجوہ کی بناء پر غالب ایک اعلیٰ درجہ کے انشاء پرداز تسلیم کئے جاتے ہیں۔

پنج آہنگ۔ دستنبو۔ مہر نیم روز۔ ایک مختصر دیوان اردو۔ کلیات فارسی اردو خطوط کے مجموعے۔ عود ہندی۔ اور اردوئے معلیٰ وغیرہ آپ کی بہترین یادگار ہیں۔ ان کے علاوہ تین مختصر رسالے تیغ تیز۔ لطائف غیبی نامہ غالب بھی آپ کی ادبی خدمات ہیں۔

۲۔ سر سید احمد خاں

سید احمد خاں ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ رسمی تعلیم کے بعد سر رشتہ دار ہوئے۔ اور پھر سب جج ہو گئے۔ ۱۸۶۶ء میں علیگڈھ کالج کی بنیاد رکھی۔ علیگڈھ ہی میں مقیم ہو گئے۔ اور ساری زندگی قومی تعلیم میں صرف کی۔ آخر کار ۱۸۹۸ء میں انتقال کیا۔ اور کالج کے بیرونی حصے میں دفن کئے گئے۔

سر سید کو علم و ادب سے فطری تعلق تھا۔ سن شعور کے پہنچتے ہی مختلف رسالوں میں اصلاحی مضامین لکھنا شروع کر دیئے۔ اس رسالہ میں ملک کے بہترین لکھنے والوں کے مضامین نکلتے تھے۔ جن کی زبان صاف اور سادہ ہوتی تھی تاکہ ہر شخص اس کے مضامین سے فائدہ اٹھا سکے۔ اس رسالہ کے ذریعہ سے سر سید نے ملک میں اردو کے بہت سے ادیب بھی پیدا کئے۔

سر سید بہت نیک دل تھے۔ انھوں نے اپنی ساری عمر لوگوں کی خدمت میں صرف کی۔ شروع میں آپ کو شاعری سے بھی لگاؤ رہا۔ لیکن طبیعت کا جھکاؤ نثر کی طرف تھا لہذا نثر کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان کے زمانہ میں اردو زبان میں ایسی صلاحیت نہ تھی کہ اس میں سیاست مذہب اور اخلاق وغیرہ پر خیال آرائی کی جائے اردو میں اس قسم کے مضامین نہ تھے۔ سر سید نے اس قسم کے مضامین تحریر کئے۔ اور یہ ثابت کر دیا کہ اردو میں اس قسم کے

مضامین کے اظہار کی صلاحیت ہے۔ سرسید نے سلیس اور عام فہم زبان میں مضامین قلمبند کئے مشکل الفاظ اور پیچیدہ عبارت لکھنے سے پرہیز کیا۔ اور اپنے مطلب کو بیان کرنے کا وہ طریقہ اختیار کیا جو سادہ بھی تھا اور اثرانداز بھی۔ ان کے قلم سے نکلی ہوئی بات دل پر اثر ہی نہیں کرتی۔ بلکہ دل میں بھی جگہ کرتی ہے۔ انہوں نے ہر قسم کے مضامین قلمبند کر کے دنیا کو یہ دکھا دیا کہ اردو میں بھی ایسے مضامین لکھے جا سکتے ہیں۔

سرسید نے بہتوں کو اپنا ہم خیال بھی بنایا۔ حالی۔ شبلی۔ نذیر احمد۔ ذکاراللہ وغیرہ سب ان کے دوست اور ہم خیال تھے۔ ان سب ادیبوں نے سرسید کے خیالات اور طرز تحریر سے فائدہ اٹھایا ہے۔ کوئی ادیب ایسا نہ ہوگا۔ جو سرسید سے متاثر نہ ہوا ہو یہی وجہ ہے کہ سرسید کو اردو کا سب سے بڑا انشاپرداز تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور ان کے زمانے کو اردو ادب کا بہترین زمانہ کہا جاتا ہے۔

سرسید کی زبان میٹھی اور خالص دہلی کی ہے۔ جو بہت رواں اور سلیس ہے ان کی تحریر کا ایک ایک لفظ جادو کا اثر رکھتا ہے۔ ان کی عبارتوں میں سلاست اور روانی کے علاوہ بذلہ سنجی اور شگفتگی بھی ہے۔ انہوں نے بڑے سے بڑے مضمون کو بہت ہی سیدھے سادے انداز میں قلم بند کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں بلا کی صداقت اور بدیہا کی ہے جس کی وجہ سے ان کا انداز بیان پُراثر ہو گیا ہے۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں وہ نہایت مدلل ہوتا ہے۔ واقعات اور حالات کے اظہار پر قدرت حاصل ہے یہی وہ ندرت بیان ہے جو ان

کو دوسرے مصنفین میں ممتاز کرتی ہے۔ سرسید مضمون کے اعتبار سے طرزِ بیان اختیار کرتے ہیں اور پھر ویسے ہی الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔

سرسید کی تحریریں قواعد کی پابندی سے بری ہیں۔ انہوں نے قواعد کو جذبات کا محکوم بنایا ہے۔ وہ الفاظ کے استعمال میں بے لگام تھے۔

سرسید کی سب سے پہلی تصنیف "آثار الصنادید" ہے۔ اس میں دہلی کے بڑے لوگوں اور اچھی عمارتوں کا بھرپور ذکر ہے۔ اس تصنیف میں سرسید کی طرز تحریر کا اصلی رنگ نہیں۔ اس میں جگہ جگہ دقیق اور مشکل عبارتیں ہیں۔ جن میں دور از کار تشبیہیں اور استعارے بھی ہیں۔ اور مشکل علمی اصطلاحیں بھی لیکن اس تصنیف کے بعد جو مضامین "تہذیب الاخلاق" میں لکھے گئے ہیں وہ صاف اور سادہ ہیں۔ ان میں ابتدائی تکلف و تصنع نہیں۔

اردو میں سرسید سے پہلے مختصر مضمون نگاری کا فقدان تھا۔ لہٰذا سرسید کے طرز بیان سے زیادہ اہم ان کے مضامین ہیں جن کی ابتدا ہم سے اردو میں ہر طرح کے علمی اور سائنٹفک مضامین لکھے جانے لگے۔

سرسید کے علمی و ادبی کارناموں میں آثار الصنادید۔ رسالہ اسباب بغاوت ہند اور مجموعۂ رسالہ تہذیب الاخلاق بہت اہم ہیں۔

۳۔ محمد حسین آزاد

محمد حسین آزاد محمد باقر کے بیٹے تھے۔ یہ ایک بڑے عالم اور نامور آدمی تھے۔ اور اردو کے پہلے اخبار کے بانی بھی تھے۔ آزاد سنہ ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے۔ شعروشاعری سے دلچسپی ابتدا ہی سے تھی۔ آزاد کے اس شوق سے ان کے والد بہت متاثر ہوئے۔ اور انہوں نے آزاد کو استاد ذوق کے سپرد کر دیا۔ ذوق کی صحبت سے مستفید ہوئے۔ اور آزاد کا ادبی ذوق سنورتا گیا۔ سنہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوا۔ آزاد کے والد بے جرم و خطا شہید ہوئے گھر بار لٹا۔ آزاد نے دہلی کو خیرباد کہا۔ کچھ دنوں حیدرآباد اور دکن میں مارے مارے پھرنے کے بعد لاہور پہنچے۔ اور سررشتہ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔ آزاد میں بلا کی ادبی صلاحیتیں تھیں۔ لہذا بہت جلد مقبول ہو گئے۔ سنہ ۱۸۸۷ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا۔ آزاد کو اپنی لڑکی سے بہت زیادہ محبت تھی۔ اس کے انتقال نے ان کو بے خود کر دیا۔ ہوش و قرار کھو بیٹھے۔ اور اسی حالت میں سنہ ۱۹۱۰ء میں انتقال کیا۔ آزاد عربی اور فارسی کے ایک بڑے عالم تھے۔ بھاشا اور ہندی کی خصوصیات سے بھی واقف تھے۔ انگریزی کے عالم تو نہ تھے۔ مگر اس کی ادبی خوبیوں سے واقفیت رکھتے تھے۔ آپ کی نثر نرالی اور اچھوتی ہے۔ بیان کی لطافت زبان کی سلاست اور محاورات کی دلآویزی آپ کی نثر کی خصوصیات ہیں۔ اس اعتبار سے آزاد نے اردو نثر

میں ایک طرز خاص ایجاد کیا ہے۔ جو ان ہی پر ختم ہو گیا۔ بیان کی شوخی و رنگینی۔ رعایت لفظی کے ساتھ ساتھ ظرافت ان کے طرز کی ایک بڑی خصوصیت ہے آزاد کے چھوٹے چھوٹے جملے بہت سہل اور دلکش ہوئے ہیں۔ ان کے قلم میں بلا کی نیرنگیاں ہیں۔ وہی قلم جو آب حیات اور نیرنگ خیال لکھ کر فضلا کو حیرت میں ڈالتا ہے۔ وہی قلم جب پہیلیاں اور لوریاں لکھتا ہے تو بچے جھوم اٹھتے ہیں۔

آزاد کی عبارتیں قدیم و جدید دونوں طرزوں کی عکاس ہیں۔ ان میں جہاں سادگی و بے ساختگی ہے وہیں تکلف اور تصنع بھی ہے ان کی تحریروں میں عربی فارسی اور ہندی کے الفاظ کے علاوہ انگریزی الفاظ بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ غرضکہ ان کی تحریروں میں بھاشا کا حسن انگریزی کی صفائی اور فارسی کی دلکشی ہے۔ ان کے بیان میں بلا کی وسعت ہے۔ وہ ایک موضوع پر صفحے کے صفحے تحریر کر سکتے ہیں۔

مختصر یہ کہ آزاد کے قلم نے اردو ادب کو ایسے جواہر پارے عطا کئے ہیں جنکی نظیر ملنا مشکل ہے۔ انہوں نے آب حیات لکھ کر تنقید کی شاہراہ نکالی۔ نیرنگ خیال پیش کر کے مضمون نگاری کی انوکھی مثال رکھی۔ بچوں کے لئے مفید اصلاحی کتابیں لکھ کر اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اردو لغت لکھ کر ایک نئی راہ دکھائی۔ غرضکہ ان کی مساعی جمیلہ کی بدولت آج اردو ادب مالا مال ہے۔

طرز نگارش ایسا اچھوتا اور نرالا ہے کہ آج بھی ان کے پائے کی نثر

لکھنے والا مفقود ہے۔ سیدھے سادے بچے تلے فقرے۔ موتی کی طرح حسین الفاظ، شوخی اور رنگینی کی مرصع کاری یہی وہ خصوصیات ہیں۔ جو آزاد کی نثر میں الفاظ و معنی کا جادو جگاتی ہیں۔

آب حیات۔ نیرنگ خیال، دربار اکبری ان کی مشہور و معروف کتب ہیں۔

۴۔ الطاف حسین حالیؔ

مولانا الطاف حسین حالیؔ ۱۸۳۷ء میں بمقام پانی پت ضلع کرنال پیدا ہوئے۔ ابھی حالیؔ نو برس ہی کے تھے کہ باپ کا سایہ جاتا رہا۔ شعر و شاعری کا ذوق بچپن سے تھا۔ یہ ذوق انھیں دہلی کھینچ لایا۔ شعر و شاعری میں غالبؔ سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ اسی ذریعہ سے غالبؔ کے شاگرد نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی صحبت میں رسائی ہوئی۔ شیفتہ نے حالیؔ کو اپنے بچوں کی معلمی پر مامور کر لیا۔ شیفتہ کی صحبت نے حالیؔ کے دماغ پر بڑا گہرا ادبی اثر ڈالا۔ ان کی وفات کے بعد حالیؔ کو کسب معاش کے لئے لاہور جانا پڑا۔ جہاں ان کو پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ایک جگہ مل گئی۔ جس میں انہیں انگریزی سے اردو میں ترجمے کا کام ملا۔ کام طبیعت اور مزاج کے مطابق نہ تھا۔ لہذا کچھ دنوں بعد دہلی واپس آ گئے اور انگلو عربک اسکول میں مدرس ہو گئے۔ اسی اثنا میں سر سید سے ملاقات ہوئی۔ سر سید کے قومی جذبہ سے متاثر ہوئے۔ اور قومی شاعری کی طرف راغب ہو گئے۔ حالیؔ نے اسی غرض سے مدرسی ترک کر دی۔ اور تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف ہو گئے۔

مولانا حالیؔ کا طرز بیان آسان اور عام فہم ہے۔ ان کی ہر عبارت سلیس اور سادہ ہوتی ہے۔ ان کو عبارت آرائی اور تکلف سے نفرت تھی۔ وہ سوچ سمجھ کر

الفاظ جمع نہیں کرتے تھے۔ بلکہ جو الفاظ بے ساختہ دل سے نکل جاتے انھیں وہ سپرد قلم کر دیتے تھے۔

مولانا کی زبان خالص دہلی کی ٹکسالی زبان ہے۔ عربی و فارسی کے فقرے بھی ان کی تحریروں میں بہت عام ہیں۔ مگر ڈاکٹر نذیر احمد کی طرح کثرت نہیں۔ البتہ انگریزی کے بہت سے الفاظ جگہ جگہ استعمال کئے ہیں۔ جو اکثر گراں معلوم ہوتے ہیں۔ لطف تو یہ ہے کہ انہوں نے بہت سے انگریزی الفاظ ایسے بھی استعمال کئے ہیں جن کے مترادف اردو میں موجود ہیں۔ حالی کے یہاں ایک بڑی کمی یہ بھی ہے کہ ان کی عبارتوں میں آزاد کی سی رنگینی اور دلکشی نہیں۔ اگر ہے تو برائے نام۔ مگر تحقیق کے میدان میں وہ آزاد سے بہت آگے ہیں۔

حالی نے اردو ادب میں تنقید اور سوانح نگاری کی ابتدا کی ہے، وہ اس اعتبار سے ایک بڑے نقاد اور سوانح نگار ہیں۔ حیاتِ سعدی۔ حیات جاوید اور یادگار غالب اردو کی مشہور سوانح بھی ہیں اور تنقیدیں بھی۔ ان میں سعدی سرسید اور غالب کے تفصیلی حالات کے ساتھ ان کے کلام پر بھی آزادانہ بحث کی گئی ہے۔ واقعات کی چھان بین میں حالی نے بڑی کاوش سے کام لیا ہے۔ مقدمہ شعر و شاعری حالی کی دوسری عالمانہ تنقیدی کتاب ہے۔ اس میں انہوں نے اردو شاعری پر مدلل اور عالمانہ تنقید کی ہے۔

حیات سعدی حیات جاوید۔ یادگار غالب۔ مقدمہ شعر و شاعری۔ تریاق مسموم اور مجالس النساء ان کے مشہور نثری کارنامے ہیں۔

۵- شبلی نعمانی

مولانا شبلی نعمانی ۱۸۵۷ء میں بمقام اعظم گڈھ پیدا ہوئے۔ مولانا کو علم وادب سے ازحد دلچسپی تھی۔ چنانچہ تحصیل علم کی غرض سے مختلف مقامات کا دورہ کیا۔ غازی پور میں رہ کر محمد فاروق صاحب سے منقول اور معقول حاصل کیا۔ رام پور میں ارشاد حسین صاحب سے علم فقہ پڑھا۔ اور سہارنپور میں رہ کر مولوی امجد علی صاحب سے علم حدیث کا درس لیا اور جب سر سید سے ملاقات ہوئی۔ تو علی گڈھ پہنچے۔ وہاں اور بہت سے عالموں سے ملاقات ہوئی خصوصاً پروفیسر آرنلڈ کی صحبت سے بہت زیادہ مستفید ہوئے۔ سر سید کی وفات کے بعد مولانا شبلی حیدرآباد پہنچے اور محکمہ تعلیمات میں ناظم ہو گئے حیدرآباد میں مولانا نے اردو کی بڑی خدمت کی۔ انجمن ترقی اردو کی بنیاد ڈالی لکھنؤ میں ندوۃ العلماء کی بنیاد آپ ہی کے ہاتھوں رکھی گئی۔

آخری عمر میں لنگڑے ہو گئے۔ ۱۹۱۲ء میں انتقال کیا۔

مولانا شبلی اردو کے مایۂ ناز ادیب ہیں۔ انہوں نے مختلف علوم وفنون پر طبع آزمائی کی ہے۔ علم کلام، تنقید، تاریخ اور سیرت نگاری کے موضوعات پر بہت کچھ لکھا ہے۔ تاریخ اور تنقید کے میدان میں وہ بہت آگے ہیں۔ وہ تاریخ نگار کی حیثیت سے بہت اہم ہیں۔ تاریخ نویسی میں ان کا اسلوب نہایت سنجیدہ اور دلکش ہے۔ انہوں نے اپنی علمی صلاحیتوں کی وجہ سے تاریخ جیسے خشک موضوع کو نہایت دلچسپ اور پُر لطف بنا دیا ہے ان کی ساری تصانیف بڑی

کاوش اور تحقیق کا نتیجہ ہیں۔ ایک نقاد کی حیثیت سے بھی ان کا مقام بہت بلند ہے انہوں نے اپنی تنقیدوں میں مغرب کے جدید اصولوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ موازنۂ انیس و دبیر لکھ کر اردو میں تقابلی تنقید کی بنیاد رکھی۔

شبلی کا طرزِ تحریر سلیس عام فہم پر زور اور دلپذیر ہے۔ زبان میں بلا کی سنجیدگی اور زور ہے۔ شبلی کی تحریروں میں ادبی شان کے علاوہ شوخی اور حسن بھی ہے مگر آزاد کی سی شوخی ان کی تحریروں میں کم ہے۔ شبلی کی تحریریں صاف واضح اور مدلل ہوتی ہیں۔ اردو میں کاروباری نثر کا اس سے بہتر نمونہ نہیں مل سکتا۔ سر سید شبلی کی تحریروں کو بہت پسند کرتے تھے۔

مولانا کی بہت سی تصانیف ہیں۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ ہر کتاب لاجواب ہے۔ اور ہر تصنیف پہلی سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ سیرۃ النبی۔ الفاروق۔ المامون شعر العجم۔ موازنہ انیس و دبیر۔ اور سفرنامہ روم و شام آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔

سیرۃ النبی، الفاروق، المامون، سیرت نگاری کی ایسی کتابیں ہیں جن سے ہر اہل اسلام فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ شعر العجم۔ موازنہ انیس و دبیر اور سفرنامہ روم و شام ادبی تصانیف ہیں جن سے ہر مذہب و ملت والا فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔ غرضکہ مولانا شبلی ایک غیر معمولی قابلیت کے انسان تھے۔ انہوں نے اپنی قلیل سی عمر میں بہت عالمانہ تصنیفیں یادگار چھوڑی ہیں۔

۶۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار

پنڈت رتن ناتھ سرشار ۱۸۴۷ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم کے بعد انگریزی کی طرف رجوع ہوئے۔ لیکن کوئی سند حاصل نہ کر سکے۔ شعر و شاعری اور مضمون نگاری سے سرشار کو فطری لگاؤ تھا۔ لہٰذا اودھ پنچ اور دوسرے رسالوں میں ان کے مضامین چھپتے رہے۔ کچھ دنوں کے بعد اودھ اخبار کے ایڈیٹر بھی ہو گئے۔ یہاں ان کو تصنیف و تالیف کا اور زیادہ موقع ملا۔ فسانۂ آزاد کی سی دلچسپ کتاب اسی اخبار میں قسط وار شائع ہوتی رہی۔ شراب کے بہت عادی تھے۔ اس کی کثرت کی وجہ سے جسم لاغر ہو گیا تھا۔ آخر کار ۱۹۰۲ء میں بمقام حیدرآباد رحلت فرمائی۔

سرشار کی شخصیت بحیثیت ادیب بہت ممتاز ہے۔ وہ جدید ناول نگاری کے موجد تصور کئے جاتے ہیں۔ ان کی ناولوں میں انگریزی ناولوں کی خصوصیات موجود ہیں۔ اردو زبان پر انہیں کافی عبور حاصل تھا۔ فارسی اور عربی کے بھی اچھے عالم تھے۔ ان کے سارے مضامین قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں۔ کیونکہ سرشار غور و فکر کے عادی نہ تھے۔ ان کی طبیعت میں بلا کی شوخی، رندی اور سرمستی تھی۔ چنانچہ ان کے تمام مضامین اور تحریریں ظرافت اور شوخی کے حسن سے مالا مال ہیں۔

سرشار ایک بڑے حقیقت نگار بھی تھے۔ واقعات کی سچی تصویر کشی میں

ماہر تھے۔ انہوں نے فسانۂ آزاد میں لکھنؤ کی سوسائٹی کی جو تصویریں پیش کی ہیں۔ وہ ہر اعتبار سے مکمل اور حقیقی ہیں۔ سرشار کی تحریروں میں لکھنؤ کی جیتی جاگتی اچھی تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں، اتنی کسی دوسری تصنیف میں نہیں۔ انہوں نے اپنے عہد کے لکھنؤ کی شائستگی اور طرز معاشرت کا نقشہ پیش کیا ہے۔

فسانۂ آزاد کی ایک ایک سطر ظرافت اور حقیقت کے حسن سے مالامال ہے سرشار کردار نگاری اور مکالمہ نویسی میں بھی ماہر تھے۔

اسلوب کے لحاظ سے بھی وہ آزاد سے کم نہیں۔ ان کی تحریروں میں بھی آزاد کی طرح جدت شوخی اور رنگینی ہے۔ بیان کی شگفتگی اور زبان کی پاکیزگی میں وہ بے مثال ہیں۔ محاورات کے استعمال میں بھی ان کو خاص قدرت حاصل ہے لیکن بعض بعض موقعوں پر ان کی عبارت شعر کی طرح رنگین ہو جاتی ہے۔ بیچ بیچ میں اکثر فارسی اور عربی کے اشعار پیش کرتے ہیں جن کی وجہ سے لطف جاتا رہتا ہے۔

فسانۂ آزاد (چار جلدوں میں) سرشار کی بہت مشہور تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ جام سرشار۔ سیر کہسار (دو جلدوں میں) خدائی فوجدار اور طوفان بے تمیزی ان کی دوسری مشہور اور پر لطف تصنیفیں ہیں۔

۷۔ عبدالحلیم شرر

عبدالحلیم شرر ۱۸۶۰ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایک اچھے طبیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے عالم بھی تھے۔ بچپن کا حصہ لکھنؤ اور کلکتہ میں گذرا۔ اور جوانی لکھنؤ ہی میں کٹی۔ شرر کی زبان اور بول چال پر لکھنوی زبان کا گہرا اثر ہے۔ بچپن سے ہی ان کو علم و ادب سے لگاؤ تھا۔ اخبارات اور رسالے پڑھنے کے بڑے شوقین تھے۔ اکثر مضامین لکھتے اور رسالوں میں شائع کراتے تھے۔ وہ "اودھ اخبار" کے مستقل لکھنے والوں میں تھے لیکن بعد میں اودھ اخبار سے قطع تعلق کر کے اپنا ذاتی رسالہ "دلگداز" نکالنے لگے تھے۔

مولانا نے تمام عمر علم و ادب کی خدمت کی۔ اور اس میدان میں بڑی شہرت بھی حاصل کی۔ مولانا کے مضامین کا رنگ ڈھنگ تو انگریزی تھا لیکن خیالات بالکل دیسی تھے۔ شرر کا یہ انوکھا طرز نوجوان طبقہ میں بہت مقبول تھا۔ انہوں نے سینکڑوں مضامین اور ناولیں لکھی ہیں جو بہت پسند کی گئیں۔

شرر کی متعدد ناولیں ہیں۔ جو زیادہ تر تاریخی ہیں۔ ان میں "ملک العزیز ورجنا" منصور موہنا۔ حسن انجلینا، فردوس بریں، فتح اندلس، فلورا فلورنڈا، وغیرہ بہت مشہور رہیں ان کی ناولوں کے پلاٹ خالص مشرقی ہیں۔ ایشیا کا کوئی ملک ایسا نہ ہوگا۔ جس کے متعلق مولانا نے کوئی ناول قلمبند نہ کیا ہو۔ ان کے سارے ناول ایک مخصوص فضا میں سانس لیتے ہیں۔ مولانا کا رجحان اسلامی

تاریخ کی طرف مائل تھا۔ لہٰذا ان کے سارے ناولوں نے قدیم اسلامی حالات کی نقاب کشائی کی ہے۔ ان کے ہر ناول سے اسلاف کے کارناموں اور مسلمانوں کے جوش و ولولوں کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اردو میں تاریخ سے متعلق ناول نہ تھے۔ شرر نے اس کمی کو پورا کیا۔ اس طرح شرر کے ہاتھوں اردو میں بھی تاریخی ناولوں کی ابتدا ہوئی۔ انہوں نے اسلامی تاریخ کو ناولوں کے مواد کے لئے صرف کیا۔ اس طرح ناول ہرزہ سرائی اور ابتذال سے بچ کر سنجیدگی اور متانت سے مالا مال ہو گئے۔ یہ شرر کی دلکش تحریروں کا نتیجہ ہے کہ تاریخ جیسا خشک موضوع بھی ان کی ناولوں میں دلکش اور دلچسپ بن گیا ہے۔

شرر کردار نگاری کے گُر سے واقف نہ تھے۔ منظر نگاری میں خاص قدرت حاصل تھی۔ کسی بھی منظر کی تصویر کشی میں ماہر ہیں۔ قدرتی مناظر کا سامان بہت اچھا پیش کرتے ہیں۔ قدرت و فطرت کی باریک سے باریک شے ان کی نظر سے اوجھل ہونے نہیں پاتی۔ لیکن ان کا دماغ حد سے زیادہ شاعرانہ تھا۔ شاعرانہ تشبیہات اور استعارات کی بھرمار کی وجہ سے اکثر طبیعت اکتا جاتی ہے۔

اردو ناول نگاری میں شرر کا وہی مقام ہے جو انگریزی میں سر والٹر اسکاٹ کا ہے۔ ہم ان کو بحیثیت ناول نگار اردو کا سر والٹر کہہ سکتے ہیں۔

شرر کی طبیعت بڑی ہمہ گیر تھی۔ انہوں نے سیکڑوں موضوعات پر زور طبع دکھلایا ہے۔ ان کا انداز بیان ہر جگہ دلکش اور حسین ہے۔ طرزِ تحریر شگفتہ اور رواں ہے۔

۸۔ مولانا راشد الخیری

مولانا راشد الخیری ۱۸۶۸ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ آپ نے تھوڑی بہت ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ اور پھر محکمہ بندوبست میں ملازم ہو گئے۔ لیکن نوکری میں جی نہ لگا اور اس کو چھوڑ کر ادبی زندگی اختیار کی۔ مرتے دم تک اس میں لگے رہے۔ راشد الخیری کو مستورات کی تعلیم و تربیت اور ان کی ترقی سے خاصی دلچسپی تھی۔ لہذا آپ نے انہی کے حقوق کی نگہبانی میں اپنی ساری زندگی صرف کر دی۔ عورتوں کا مشہور رسالہ "عصمت" اسی جذبہ کی یادگار ہے۔ جو اپنی اعلیٰ روایات کے ساتھ صنف نازک کی خدمات انجام دے رہا ہے۔

صبح زندگی، شام زندگی، شب زندگی، گودڑ کا لال، ماہ عجم، اور سمرنا کا چاند، ان کی مشہور تخلیقات ہیں۔ ان میں مولانا نے صنف نازک کی کمزوریوں پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتابیں شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ ان ناولوں میں صبح زندگی شام زندگی اور نوحہ زندگی بہت مشہور ہیں۔ مذہبی کتابوں میں آمنہ کا لال اور گدڑی کا لال بہت مقبول ہیں۔ مولانا کا اسلوب بیان نہایت صاف سلیس اور مؤثر ہے۔ وہ عورتوں کی باتیں عورتوں کے لئے، عورتوں ہی کی زبان میں بڑی خوبی

سے پیش کرتے ہیں۔ الفاظ نرم اور ملائم ہوتے ہیں۔ فقرے چھوٹے اور دلکش ہوتے ہیں، جن میں خفیف سا طنز اور مزاح بھی ہوتا ہے۔

مولانا فطرتاً حزن وملال، غم و اندوہ کی لفظی تصویریں تیار کرتے ہیں اس میں ماہر ہی نہیں بلکہ اپنا ثانی بھی نہیں رکھتے۔ وہ ہر قصے کو داستانِ غم کی حقیقی تصویر بنا کر پیش کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کو "مصورِ غم" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

(الف)

فرہنگ

قصہ آزاد بخت

قلم رو۔ سلطنت
مُزاحم۔ روکنے والا
بعید۔ دُور
لاثانی۔ بے مثال
دروغ۔ جھوٹ
بندی خانہ۔ جیل خانہ
بے تقصیری۔ بے گُناہی
زنداں۔ قید خانہ
سخنِ راست۔ سچی بات
ماتم سرا۔ ماتم کا گھر
خواصیں۔ خدمت گزار عورتیں
شکیل۔ خوبصورت
پکھاوج۔ ایک قسم کا باجا
رتجگا۔ ایک قسم کی خوشی کی نیاز
رحم تلی۔ ایک قسم کا حلوہ
پنڈت خانہ۔ جیل خانہ

اغلب۔ ممکن۔ شاید
آہنی۔ لوہے کی
مخلصی۔ چھٹکارا
چرم۔ چمڑا
استخواں۔ ہڈی
بدہیئت۔ بُری شکل والا
مسلح۔ ہتھیار بند
رومال تارکشی۔ سونے چاندی کے تاروں کا بنا ہوا رومال
تملّق۔ شان و شوکت
گذری۔ بازار
صندلی۔ کُرسی
لنگری۔ طشت
سگ پرست۔ کُتّا پوجنے والا
مجوز۔ مُصِر
سکھپال۔ پالکی

نوروز

اقبال - بلندی

زیبا ہے - ٹھیک ہے

قلیل - تھوڑا

داروئے بیہوشی - غفلت کی دوا مراد غافل

غلغلہ - شور - ہنگامہ

سولزلیشن - تہذیب

پٹریاٹزم - حب الوطنی

طمطراق - شان وشوکت - بڑھا چڑھا کر

ترقی علم انشاء

علم انشا - مضمون نویسی کا علم

کج مج - ٹھیڑی آڑی

یاری - مدد

آرٹکلوں میں - مضمونوں میں

سحر بیانی - جادو بیانی

متعدد - لاتعداد

دقیانوسی - پرانے قدیم

سامعین - سننے والے

مستقل - رائج - استعمال میں آنے والے

رفارم - اصلاح - سدھار

آب زلال - صاف شفاف اور میٹھا پانی

نیچرل پوئٹری - فطری شاعری

ہم سر - ہم پلہ

علوم کی بدنصیبی

غلط نما - جھوٹے

نالاں - پریشان - عاجز

واجب الرحم - رحم کے لائق

اہل کمال - صاحب فن کمال والے

انبوہ در انبوہ - گروہ در گروہ - بھیڑ کی بھیڑ مراد بہت سے لوگ

ثابت قدم - مستقل مزاج

کثرت کار - کام کی زیادتی

مدارِ کار ہے۔ کام موقوف ہے۔

ثمرِ مراد۔ اُمید کا پھل۔ مراد کا پھل

دربدری۔ بھٹکنا

صدقِ دل۔ دل کی سچائی سے محنت

نفع رساں۔ نفع پہنچانے والا

حق تلفی۔ حق مارنا

کوکب۔ ستارہ

رفعت۔ بلندی

متانت۔ سنجیدگی

فرودگاہیں۔ قیام گاہیں

جمعیت۔ مخلوق

خام خیالی۔ غلط فہمی

خلعت۔ پوشاک

مرزا ظاہر دار بیگ

دستک دینا۔ کنڈی کھٹکھٹانا

بے عنوانی۔ بے قاعدگی بدانتظامی

رشوت ستانی۔ رشوت لینا

اعتداد۔ شمار

رودار۔ وضعدار لوگ

اوائل۔ اول کی جمع۔ آغاز۔ ابتدار

حسبۃً للہ۔ برائے خدا

تکفل۔ ضامن ہونا سرپرستی

بے اعتنائی۔ بے پروائی

نمود۔ نمائش

ادعائی۔ بڑائی

زبون۔ بُرا

آصف خانی۔ ایک قسم کا شلوکہ

ساق۔ پنڈلی

بے ہنگام۔ بے موقع

استراحت۔ آرام

اشتداد۔ زیادتی

شمہ۔ قلیل

سخن سازی۔ باتیں بنانا

متبنیٰ۔ گود لیا ہوا

حمیت ۔ عزت

سہار ۔ برداشت

اشتہا ۔ بھوک

اردو غزل پہ ایک نظر

لبسوط اور طولانی ۔ لمبی چوڑی

دور از کار ۔ خیالی

قوت متخیلہ ۔ سوچنے کی قوت

لبسیط ۔ چوڑا ۔ پھیلا ہوا

متکیف ۔ خوش ہونا مزہ لینا

مساعد ۔ مدد

چٹخارہ ۔ لطف

ٹھمری ۔ ایک گیت

دھرپت ۔ ایک ہندی راگ

مطائبہ ۔ ہنسی مذاق

ترمیم ۔ تبدیلی

اعلتنا ۔ توجہ

شاہد ۔ معشوق ۔ محبوب

ملتبہ ۔ آگاہ

اودھ کی آخری صحبت

دادِ سخن ۔ شاعری کی تعریف

طفلی ۔ بچپن

اقامت گزیں ۔ پناہ گزیں

آباد قیام پذیر

خفیف ۔ معمولی ۔ تھوڑا سا

مسند نشینی ۔ تخت نشینی

پیوند زمین ہونا ۔ دفن ہونا ۔ مرنا

نکتہ چینی ۔ عیب جوئی

مذمت ۔ برائی

معیوب ۔ گری ہوئی ۔ خراب

تعفن ۔ بدبو

اذیت رساں ۔ نقصان دہ

جادہ ۔ راستہ

رنگے سیار

مکین ۔ رہنے والے

طرز نشست ۔ بیٹھنے کا ڈھنگ

آفتابہ ۔ لوٹا ۔ برتن

کشیدہ قد - لمبا قد
تنومند تنو مند جسیم - بڑے ڈیل ڈول والا
دل کشا - دلکش
اغل بغل - اِدھر اُدھر - دونوں جانب
اشراق - آفتاب طلوع ہونا، مجازاً دو رکعت نماز نفل جو آفتاب کے نکلنے کے بعد پڑھی جاتی ہے
درویش معمر - سن رسیدہ فقیر
کندہ تراش - غبی الذہن
کذب - جھوٹ
کشف - کرشمہ
ضعف الاعتقاد - کچے اعتقاد والا
دم بخود - حیران
قعر جہنم - دوزخ کا عذاب

چرخ شعبدہ باز

بھان متی - مداری - شعبدہ باز
کسی کے آگے کان پکڑنا - کسی کو استاد ماننا - مطیع ہونا۔
نظر باز - عیاروں کو بھانپ جانے والا
عالم اسباب - مراد دنیا
اربعۂ عناصر - چار عنصر - آب - خاک - باد آتش -
اونٹ کٹارے - ایک چھوٹا سا کانٹے دار درخت جس کو اونٹ بڑے شوق سے کھاتا ہے -
گردش دولابی - چرخ کی گردش
خوباں - معشوق
خرامِ ناز - رفتار
خرابی بصرہ - بڑی مشکل یا دقت
مادر گیتی - مراد دنیا

خیال بمقابلہ زبان

خون جگر کھانا - سخت محنت کرنا -

فسانۂ عجائب ۔ رجب علی بیگ سرور کی ایک کتاب کا نام

اردوئے معلّیٰ ۔ غالب کے خطوط کا مجموعہ

اجیرن ہونا ۔ بار خاطر ہونا حیران ہونا

سقّہ ۔ بھشتی

انحطاط ۔ زوال

صغیر سنی ۔ بچپن

شاہدِ بازاری ۔ طوائف

عاری ۔ خالی ۔ قاصر

اُردو لٹریچر کے عناصر خمسہ

عناصر ۔ مراد پانچ مصنفین سے ۔ سر سید حالی شبلی نذیر احمد اور آزاد

لٹریچر ادب

نشاۃ الثانیہ دور جدید

منازل ارتقائی ۔ ابتدائی منزلیں

بازگشت ۔ گونج

شریف النفس ۔ نیک

اختراع ۔ ایجاد

استقرار ۔ قرار پانا

استخراج ۔ مرضی معلوم کرنا

لائف نگاری ۔ سوانح نگاری

ساقط المعیار ۔ معیار سے گرا ہوا

سوئٹزرلینڈ کی سیر

مرجع انام	مخلوقات کا ہجوم
متردد	فکرمند
اختر شماری	تارے گننا
تخلیے میں	تنہائی میں
اسلحہ	ہتھیار
مقطوع	کٹا ہوا